مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

درس ۱۰

تعمیر سیرت کی اساسات اور قرآن کا انسان مطلوب

سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

تعمیرِ سیرت کی اساسات

اور قرآن کا انسانِ مطلوب

سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36-کے ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 03-5869501

نام کتاب ———— تعمیر سیرت کی اساسات (درس نمبر۱۰)

بارِاول (اپریل ۱۹۹۷ء) ———— ۲۲۰۰

بارِدوم (مارچ ۲۰۰۲ء) ———— ۲۲۰۰

ناشر ———— ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ———— ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰

فون: ۰۳۔۵۸۶۹۵۰۱

مطبع ———— شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت ———— ۱۲ روپے

درس ۱۰

تعمیر سیرت کی اساسات

اور قرآن کا انسانِ مطلوب

سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی روشنی میں

اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ○ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ' هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ ﴾ —— صدق اللّٰه العظيم

"کامیاب اور بامراد ہوئے اہل ایمان' جو اپنی نمازوں میں خشوع سے کام لیتے ہیں' اور جو بیکار اور بے مقصد باتوں سے احتراز کرتے ہیں' اور جو تزکیہ نفس پر مسلسل کاربند رہتے ہیں' اور جو اپنی شرم گاہوں یعنی اپنی شہوت کی حفاظت کرتے ہیں' سوائے اپنی بیویوں یا باندیوں کے' لہٰذا ان کے اس معاملے میں ان پر کوئی ملامت نہیں ہے' لیکن جو کوئی اس سے تجاوز کرے گا تو وہی حد سے بڑھ جانے والے ہیں' اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی پابندی کرتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی ہیں وہ لوگ جو وارث بنیں گے' جنہیں جنت الفردوس کی وراثت ملے گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

یہ سورۃ المومنون کی ابتدائی گیارہ آیات ہیں' جن پر ہمارے اس منتخب نصاب کا دسواں سبق مشتمل ہے۔ اسی سبق سے اس منتخب نصاب کے تیسرے حصے کا بھی آغاز ہوتا ہے' جو قرآن حکیم کے چند ایسے منتخب مقامات پر مشتمل ہے جن میں اعمال صالحہ کی کسی قدر تفصیل بیان ہوئی ہے۔ یعنی انسانی زندگی کے عملی اور اخلاقی پہلو اُجاگر کئے گئے ہیں۔ اگرچہ اس سے قبل اس سلسلۂ درس میں اب تک ہونے والے تمام دروس میں بلااستثناء ایمان کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے عملی اور اخلاقی پہلوؤں کا بھی ذکر ہوا ہے' اور ایمان کے عملی تقاضے' ایمان کے عملی لوازم' ایمان کے عملی اور اخلاقی نتائج قریباً تمام اسباق میں ہمارے سامنے آتے رہے ہیں' لیکن اس حصے میں بنیادی طور پر ہماری توجہ اعمال صالحہ ہی کی بحث پر مرتکز رہے گی ـــــ اور اس میں جو تدریج پیش نظر ہے اسے آپ پہلے ہی سے ذہن نشین فرمالیں۔ وہ یہ کہ سب سے پہلے ہم ایک فرد' ایک شخص' ایک انسان کی سیرت و کردار میں جو اوصاف مطلوب ہیں' ان کے اعتبار سے قرآن مجید کے بعض مقامات کا مطالعہ کریں گے۔ گویا کہ ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ قرآن کا انسانِ مطلوب کیسا ہوتا ہے! جس کی نقشہ کشی علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں "مردِ مومن" کے حوالے سے کی ہے ـــــ اس کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں! اس کی سیرت و کردار میں کون سے پہلو نمایاں ہوتے ہیں!

پھر یہ بحث ہمارے اس سلسلہ سبق میں دو سطحوں پر آئے گی۔ ایک تو یہ کہ تعمیر سیرت کیلئے اساسات کون سی ہیں۔ یعنی وہ بنیادیں کون سی ہیں کہ جن پر ایک اعلیٰ سیرت و کردار کی عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہر عمارت کی ایک بنیاد ہوتی ہے' اسی بنیاد پر وہ عمارت اٹھتی ہے اور اسی بنیاد کے مستحکم ہونے پر اس عمارت کے استحکام کا دار و مدار ہوتا ہے۔ لہٰذا تعمیر ذات یا تعمیر سیرت یا اگر علامہ اقبال کی اصطلاح مستعار لی جائے تو تعمیر خودی کیلئے قرآن مجید کیا لائحہ عمل پیش کرتا ہے اور اس کی اساسات کیا ہیں! پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ جب ان بنیادوں پر ایک انسانی شخصیت کی بتمام و کمال تعمیر ہو جاتی ہے تو اس کے امتیازی خد و خال کیا ہوتے ہیں! اس میں جو حسن اور جو دل کشی پیدا ہوتی ہے وہ کن اوصاف کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ مردِ مومن کے بارے میں علامہ اقبال کا ایک شعر ہے ؎

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن!
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

تو مومن کی شخصیت کی جو دل آویزی ہے وہ کون کون سی خصوصیات اور اس کے کون کون سے اوصاف پر مبنی ہے!

پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ جب ایک فرد سے آگے بڑھ کر ایک خاندان وجود میں آتا ہے تو خاندان اور عائلی زندگی کے سلسلہ میں قرآن مجید ہمیں کیا رہنمائی دیتا ہے اور اس کی عملی تشکیل کے لئے کیا اصول دیتا ہے! قرآن مجید کے نزدیک ایک اچھا خاندان کون سا ہے! اس کے خصائص و اوصاف کیا ہیں!

اس سے ہم جب آگے بڑھیں گے تو دیکھیں گے کہ خاندانوں کے مجموعے سے ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اس انسانی معاشرے میں کن اقدار و اوصاف کو قرآن مجید چاہتا ہے کہ وہ نافذ اور رائج ہوں! قرآن مجید کو کن Values کی ترویج ایک معاشرے میں اصلاً مطلوب ہے! اور از روئے قرآن وہ کون سی سماجی خرابیاں اور برائیاں (Social Evils) ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ انسانی معاشرے سے دُور رہیں اور ان کا استیصال کیا جائے۔ پھر اس عمل صالح کی بحث کی بلند ترین سطح یہ ہوگی کہ ملت و ریاست کی سطح پر، حکومت اور نظام حکومت کی سطح پر قرآن مجید ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے!

اس ضمن میں یہ ہمارا پہلا سبق ہے، جس میں دراصل وہ اساسات بیان ہوئی ہیں اور وہ بنیادیں معین کی گئی ہیں جن پر ایک مردِ مومن کی شخصیت کی تعمیر ہو سکتی ہے —— یا یوں کہہ لیجئے کہ انسانی سیرت و کردار کی پختگی کے لئے جو لوازم ہیں، ان کا تعین کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کا یہ شعر آپ کے ذہن میں ہوگا کہ ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

اِس سبق میں ہمارے سامنے یہ بات واضح ہو کر سامنے آئے گی کہ انسانی سیرت و کردار کی پختگی اور استحکام کے لئے کون سی محنت ضروری ہے، اور وہ کونسی مشقت اور ریاضت ہے جس کی طرف قرآن مجید رہنمائی کرتا ہے!

بندۂ مومن کے مطلوبہ اوصاف

اب آپ نوٹ کیجئے کہ سورۃ المومنون کی ابتدائی گیارہ آیات میں چند اوصاف سلسلہ وار بیان ہوئے ہیں۔ ان میں اہم ترین وصف ہے صلٰوۃ' جس کا ترجمہ ہم عام طور پر "نماز" کرتے ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ اوصاف کی اس فہرست میں آغاز بھی نماز سے ہوا ہے اور اختتام بھی۔ آغاز میں فرمایا گیا : ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ○ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ○ ﴾ "کامیاب ہو گئے وہ اہل ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع سے کام لیتے ہیں"۔ پھر چند اوصاف بیان کرنے کے بعد آخری وصف بیان ہوا : ﴿ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ○ ﴾ "اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں" انہیں ضائع نہیں ہونے دیتے ۔ معلوم ہوا کہ اس فہرست میں اول بھی نماز ہے' آخر بھی نماز ہے۔ اس سے یہ خصوصی رہنمائی حاصل ہوئی کہ تعمیر سیرت کا جو قرآنی پروگرام اور جو لائحہ عمل ہے' اس میں نماز کا نظام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

دوسرا وصف آتا ہے "اِعْرَاض عَنِ اللَّغْوِ" ــــــ بے کار باتوں سے احتراز کرنا' بچنا' دامن بچائے رکھنا۔ یعنی انسان اپنے وقت کی قدر و قیمت کا احساس کرے اور اپنے ہر ہر لمحہ کو مفید' بامقصد اور نتیجہ خیز بنائے۔ انسان کا وقت یا تو اِس حیاتِ دنیوی کی کسی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے صرف ہو رہا ہو' یا اپنی حیات معنوی کی تطہیر اور اس کے تزکیہ کے لئے صرف ہو رہا ہو' یا حیات اُخروی کے لئے کچھ کمانے اور بنانے میں صرف ہو رہا ہو۔ ان کاموں کے سوا وقت کا صرف ضیاع بھی ہے اور زیاں بھی۔

تیسرا وصف آتا ہے : ﴿ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ فٰعِلُوْنَ○ ﴾ "وہ لوگ جو زکوٰۃ پر عمل کرتے رہتے ہیں۔" یہاں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں عموماً زکوٰۃ کے ساتھ لفظ "اِیْتَاء" آتا ہے۔ جیسے اٰتَی الزَّکٰوةَ ۔ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ لیکن یہاں آپ نے دیکھا کہ بالکل مختلف فعل استعمال ہوا : ﴿ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ فَاعِلُوْنَ○ ﴾ یہاں فاعلون یہ مفہوم ادا کر رہا ہے کہ مسلسل کوشاں رہتے ہیں' مسلسل کاربند رہتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ تزکیہ نفس کے لئے ان کی جدوجہد مسلسل جاری رہتی ہے۔

چوتھا وصف ہے اپنے جنسی جذبہ یعنی اپنی شہوت پر کنٹرول (Sex discipline)

کہ اس کی تسکین کے لئے قرآن مجید نے جو جائز راہ معین کر دی ہے' اس پر اکتفا کیا جائے۔ اس کے بارے میں یہ بھی صراحت کر دی گئی کہ ان جائز راہوں سے اگر کوئی اپنے اس جذبہ کی تسکین کرتا ہے تو اس میں ہرگز کوئی ملامت والی بات نہیں ہے۔ جنسی جذبہ (Sexual Instinct) فی نفسہٖ شر نہیں ہے' برائی نہیں ہے' evil نہیں ہے۔ اس کا غلط استعمال درحقیقت برائی ہے۔ اگر اس میں انضباط (Discipline) ہو اور اس میں بے راہ روی اور کجروی (Pervertion) نہ ہو' یعنی اس میں نہ تو بے قابو ہونے کی کیفیت پیدا ہو اور نہ جائز راہوں سے انحراف ہو' تو فی نفسہٖ یہ کوئی ملامت والی بات نہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلاَّ عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ ﴾۔

غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں جائز راستوں کی اجازت کے لئے "غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ" کا اسلوب کیوں اختیار کیا گیا! اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں تجرد کی زندگی بسر کرنا اور اپنے جنسی جذبہ کو' جو فطرت اور جبلت میں ایک نہایت قوی جذبہ ہے' کچلنا ایک اعلیٰ ترین روحانی قدر قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ اسلام دین فطرت ہے' چنانچہ وہ اس فطری و جبلی جذبہ کو بالکلیہ کچلنے اور دبانے کو قطعی پسند نہیں کرتا۔ اس کا منشاء و مدعا یہ ہے کہ اس جذبہ کی تسکین کے لئے جائز اور حلال راہیں اختیار کی جائیں ـــــ نکاح کو اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے اپنی سنتوں میں سے ایک سنت قرار دیا ہے۔ آپ میں سے اکثر حضرات نے یہ حدیث سنی ہو گی جو ہر خطبۂ نکاح میں پڑھی جاتی ہے کہ : ((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ)) "نکاح میری سنت میں سے ہے"۔ اسی کے ساتھ ایک دوسری طویل حدیث کا یہ آخری حصہ بھی پڑھا جاتا ہے کہ : ((وَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ)) "جس کو میری سنت پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں"۔

اس مقام پر جہاں جنسی تسکین کے لئے جائز راہوں کی طرف رہنمائی کی گئی وہاں اس کے ساتھ ہی فرما دیا گیا : ﴿ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○ ﴾ "تو جو کوئی ڈھونڈے (اختیار کرے' پسند کرے) اس کے سوا کوئی اور راہ تو وہی لوگ ہیں حد سے بڑھنے والے" (یعنی طاغی اور باغی)۔

اگلی آیت میں دو اوصاف آئے۔ گویا پانچواں وصف امانتوں کی پاسداری اور چھٹا وصف ایفاء عہد۔ فرمایا : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ ﴾ "اور وہ لوگ (فلاح پا گئے) جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی پاسداری کرتے ہیں"۔ امانت داری اور ایفائے عہد کے معاملات میں چوکس رہتے ہیں۔

یہ چھ اوصاف گویا Corner stones ہیں۔ یہ وہ اساسات اور بنیادیں ہیں کہ جن پر انسانی شخصیت کی اس رخ پر تعمیر کا عمل مبنی ہو سکتا ہے جس رخ پر اللہ کو انسان کی شخصیت کی تعمیر پسند ہے۔ تعمیر ذات، تعمیر سیرت، تعمیر کردار کے بھی مختلف معیارات ہو سکتے ہیں۔ مختلف نظریات اور مختلف فلسفوں پر مبنی انسانی سیرت و کردار کے مختلف ہیولے لوگوں کے ذہنوں میں ہو سکتے ہیں، لیکن اللہ کے انسانِ مطلوب یا قرآن کے مردِ مومن کی جو سیرت و کردار اس کے خالق و مالک اور پروردگار کو مطلوب ہے اس کی تعمیر کے لئے یہ چھ ناگزیر، لابدی، اٹل (Inevitable) اساسات ہیں ـــــ ان چھ اوصاف کے بیان کے بعد پھر نماز کا ذکر فرمایا گیا تاکہ دین میں نماز کی جو اہمیت ہے وہ مستحضر رہے اور ایک مردِ مومن جان لے کہ تعمیر سیرت کا اہم ترین عامل نماز کی حفاظت ہے۔ چنانچہ فرمایا : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ ﴾

آخر میں ان لوگوں کو جو اپنے اندر یہ اوصاف مستقل طور پر پیدا کر لیں اور ان اساسات پر اپنی سیرت و کردار کی تعمیر کر لیں، بشارت دی گئی ہے کہ یہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے، جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے : ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾

سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی آیات کا تقابل

قرآن حکیم کا یہ اسلوب ہے کہ اس میں جو مضامین بتکرار و اعادہ یعنی بار بار آئیں گے گویا ان کی اہمیت مسلم ہوتی چلی جائے گی۔ چنانچہ انتیسویں (۲۹) پارے میں سورۃ المعارج کی آیات ۱۹ تا ۳۵ میں بھی تعمیر سیرت کے یہی لوازم بیان ہوئے ہیں۔ ان دونوں مقامات کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کس قدر مشابہت ہے۔ سورۃ المعارج میں

فرمایا گیا : ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًاo ﴾ "یقیناً انسان تھڑدلا اور کم ہمت پیدا ہوا ہے"۔ ﴿ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًاo ﴾ "جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو جزع فزع کرتا ہے" فریاد کرتا ہے' نالہ و شیون کرتا ہے۔ ﴿ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًاo ﴾ "لیکن جب اس کو کوئی خیر ملتا ہے (مال و دولت ہاتھ آتی ہے' اللہ تعالیٰ نعمتیں دیتا ہے) تو ان کو روک روک کر رکھتا ہے۔" سینت سینت کر رکھتا ہے' دوسروں تک انہیں پہنچنے نہیں دیتا ـــــ یہ دراصل انسان کی سیرت کی اس خامی کی طرف اشارہ ہے جس سے انسان کی رستگاری اور اس کو آزادی دلانا اس پروگرام کا مقصد ہے۔

آگے فرمایا : ﴿ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَo ﴾ "سوائے اُن کے جو نماز کے خوگر اور عادی ہو گئے ہوں" ـــــ یہاں نماز کی اتنی اہمیت سامنے آئی کہ وہاں جو "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ" کے الفاظ وارد ہوئے تھے اُن کی بجائے یہاں لفظ "مُصَلِّيْنَ" آیا۔ گویا مومن اور نمازی مترادف اور ہم معنی الفاظ ہیں ـــــ آگے فرمایا : ﴿ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَo ﴾ "جو اپنی نمازوں پر مداومت کرتے ہیں" ہیشگی اختیار کرتے ہیں۔

آگے فرمایا : ﴿ وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌo لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِo ﴾ "اور وہ لوگ جن کے اموال میں معین اور معلوم حق ہے مانگنے والوں کے لئے بھی اور ان لوگوں کے لئے بھی جو کسی سبب سے محروم ہو جائیں"۔ یہ گویا سورۃ المومنون کے الفاظ : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَo "کے مترادف الفاظ ہیں۔

آگے فرمایا : ﴿ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِo ﴾ "اور وہ لوگ جو روز جزا (یوم قیامت) کی تصدیق کرنے والے ہیں" ـــــ ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَo ﴾ "اور وہ لوگ جو اپنے رب کے عذاب سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں' ڈرتے رہتے ہیں"۔ ﴿ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍo ﴾ "اور واقعتا ان کے رب کا عذاب ایسی ہی چیز ہے جس سے نچنت نہیں ہوا جا سکتا"۔ جس سے بے خوف ہونا ممکن نہیں ہے۔ ان تین آیات کے بارے میں میں عرض کروں گا کہ ان کا تعلق "اعراض عن اللغو" سے ہے۔ یہ ایمان بالآخرت ہے جس کے نتیجہ میں دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہو جاتا ہے' اور اس کا اصل ہے "اعراض عن اللغو" یعنی بیکار باتوں سے دامن

بچانا' پہلو تہی کرنا ـــــ اس کی قدرے وضاحت ان شاء اللہ اگلے صفحات میں آئے گی۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ بعینہٖ وہ الفاظ دوبارہ آرہے ہیں جو سورۃ المومنون (آیات ۵۔۸) میں آئے تھے : ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ○﴾ البتہ یہاں ایک چیز کا اضافہ کیا گیا۔ وہ یہ کہ امانت اور عہد کے ضمن میں شہادت پر قائم رہنا' گواہی پر قائم رہنا۔ چنانچہ فرمایا : ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ○﴾ ـــــ آخر میں وہی نماز کا ذکر پھر آیا : ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ○﴾ جیسے وہاں اول و آخر نماز' ویسے یہاں اول و آخر نماز۔

آگے فرمایا : ﴿اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ○﴾ "یہ ہیں وہ لوگ جو جنتوں میں ہوں گے اور وہاں ان کا اکرام و اعزاز ہو گا" ـــــ سورۃ المومنون میں فرمایا تھا : ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ○ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ' هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○﴾ یہاں ان الفاظ میں بشارت دی گئی : ﴿اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ﴾

انسانی شخصیت میں کمزوری کے پہلو

سورۃ المومنون کی پہلی آیت ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○﴾ میں ایک اصطلاح وارد ہوئی ہے : "فلح" ـــــ یہ لفظ قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے' مثلاً : ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○﴾ اور سورۃ المعارج کا جو حصہ سورۃ المومنون کی ابتدائی گیارہ آیات کے مشابہ ہے' اس کے آغاز میں الفاظ آئے کہ : ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ○﴾ "بے شک انسان تھڑدلا اور کم ہمت پیدا کیا گیا ہے"۔ اس کی مزید وضاحت ہوئی : ﴿اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ○﴾ "جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو جزع فزع کرتا ہے" نالہ و شیون سے کام لیتا ہے' فریاد کرتا ہے' چیختا چلاتا ہے۔ ﴿وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ○﴾ "اور جب اسے خیر یا بھلائی یا دولت ملتی ہے تو اسے سینت سینت کر' سمیٹ سمیٹ کر اپنے ہی پاس رکھنے کی کوشش کرتا ہے"۔ اپنے دوسرے ابناء نوع کو اس میں حصہ دار بنانے کی ہمت

نہیں رکھتا۔

چنانچہ ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ انسان کی شخصیت میں ضعف اور کمزوری کے وہ کون کون سے پہلو ہیں جن کی نشان دہی قرآن مجید نے کی ہے اور جن کے ازالہ کے لئے انسان کو محنت و مشقت اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے ایک بڑی عجیب حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک طرف قرآن مجید انسان کی عظمت کو نمایاں (Emphasise) کرتا ہے کہ یہ بہت اعلیٰ خلقت کا حامل ہے۔ دوسری طرف قرآن مجید انسانی خلقت کے بعض خلا اور اس کی بعض کمزوریوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ ایک طرف بلندیاں ہیں اور ساتھ ہی پستیاں ہیں۔ جیسے سورۃ التین میں فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۝﴾ "ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا' پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا"۔ اس کی بہت خوبصورتی سے شیخ سعدی رحمہ اللہ نے ترجمانی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

آدمی زادہ طرفہ معجون است از فرشتہ سرشتہ وز حیوان

یہ انسان' آدمی زادہ' حضرت آدم کی اولاد عجیب مرکب وجود کا حامل ہے۔ یہ گویا چوں چوں کا مربہ ہے۔ اس میں ایک جانب بڑی بلندیاں ہیں' وہ بلندیاں جو اسے ملائکہ کا ہم پلہ ہی نہیں مسجود بناتی ہیں۔ دوسری طرف اس میں ایسی پستیاں ہیں کہ یہ خالص حیوانات کی سطح پر بھی گر جاتا ہے۔ پس اس میں ملکوتیت اور حیوانیت کے اوصاف بیک وقت موجود ہیں ـــــ اگر ہم خود کچھ دروں بینی کی عادت ڈالیں اور اپنے اندر بھی جھانکا کریں تو ہمیں خود محسوس ہو گا کہ یہ دو متضاد تقاضے ہمارے اندر موجود ہیں۔ خیر و شر کے عواطف و میلانات بیک وقت ہمیں اپنے باطن میں محسوس ہوتے ہیں۔ ایک طرف ہمارے اندر نیکی' بھلائی' علو ہمت اور کردار کی بلندی کی طرف رجحان بھی موجود ہے اور دوسری طرف پستی کی طرف میلان بھی خود ہمارے اندر موجود ہے۔ اسے ہم تعبیر کرتے ہیں کشمکش خیر و شر سے' جس کے داعیات اور عواطف و میلانات ہمارے اپنے اندر موجود ہیں ـــــ اسی کو علامہ اقبال نے ایک مقام پر "معرکہ روح و بدن" سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش!
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسہ!
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

فرائڈ ایک بہت بڑا ماہر نفسیات شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے بہت سے نظریات گمراہ کن بھی ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے انسانی نفسیات کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرائی میں اتر کر کیا ہے۔ اس کے یہاں انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے ضمن میں جو اصطلاحات ملتی ہیں ان میں ایک طرف "IDD" اور "LIBIDO" ہے، یعنی حیوانی جبلتیں اور حیوانی تقاضے (Animal Instincts) اور دوسری طرف "EGO" اور "SUPER EGO" یعنی "انا" اور "انائے کبیر" بھی موجود ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کو رفعت اور اخلاق کی بلند منزلوں کی طرف کھینچتی ہیں۔

قرآن مجید نے بھی "نفس" کو کہیں تو ایک وحدت کی حیثیت سے لیا ہے تو وہ پستی کا مظہر ہے اور اس کے مقابلہ میں قلب و روح کو بلندی اور رفعت کا مظہر قرار دیا ہے —— کہیں ایسا ہوا ہے کہ نفس ہی کو ایک جامع اصطلاح کے طور پر لے کر اس کی تین حالتوں اور کیفیات کی نشان دہی کی گئی ہے —— ان میں سے پہلی "نفس امارہ" ہے یعنی اس میں برائی، بے حیائی، شہوت، خواہشات اور حیوانی جبلتوں ہی کی طرف سارا میلان اور رجحان ہے۔ چنانچہ تیرھویں پارے کی پہلی آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿ وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ ﴾ "میں کچھ اپنے نفس کی برأت نہیں کر رہا ہوں، نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے"۔

لیکن قرآن مجید دوسری کیفیت "نفس لوامہ" کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے اور اسے وقوع قیامت پر بطور شہادت پیش کیا ہے جس کا ہم سورۃ القیامہ میں مطالعہ کر چکے ہیں: ﴿ وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ ﴾ چنانچہ برائی پر ملامت کرنے والی چیز بھی انسان کے اپنے اندر موجود ہے۔

پھر "نفس مطمئنہ" ایک بلند ترین کیفیت ہے۔ جب آدمی زادہ حیوانیت سے آزادی اور

رُستگاری حاصل کر کے انسانیت کے بلند مقام پر متمکن ہو جائے' قائم ہو جائے' جم جائے' تو یہ ہے نفس مطمئنہ' جس کا ذکر سورۃ الفجر کے آخر میں ہے : ﴿ یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ○ ﴾ "اے نفس مطمئن! چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے"۔ لہٰذا یہ ہیں وہ متضاد میلانات و رجحانات جو انسان کے اندر موجود ہیں۔

مزید توجہ کیجئے۔ قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان مسجودِ ملائک ہے۔ قرآن مجید میں سات مرتبہ اس کا ذکر ہے کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ مزید برآں سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے کہ : ﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ﴾ "ہم نے انسان کو بڑی عزت بخشی ہے اور ہم اسے بحر و بر میں اٹھائے پھرتے ہیں اور اسے پاکیزہ رزق دیتے ہیں اور ہم نے جو کچھ بنایا ہے اس میں سے بہتوں پر اسے فضیلت عطا کی ہے"۔ یہ بھی اس کا اعزاز و اکرام ہے —— قرآن یہ بھی کہتا ہے : ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ ﴾ "ہم نے انسان کو بہترین خلقت پر پیدا کیا ہے" —— اور سورہ ص کی آیت نمبر ۷۵ میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں : ﴿ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ﴾ اس انسان کو تو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے[۱] اور اگرچہ قرآن میں تو اس کا ذکر نہیں ہے لیکن تورات میں یہ مضمون بھی آیا ہے کہ :

And God created man in his own image

اور بعینہٖ یہ مضمون حدیث نبویؐ میں بھی موجود ہے کہ : ﴿ خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ ﴾

{۱} قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ کے لئے ایسے الفاظ بھی آئے ہیں کہ جو جسم کے مختلف اعضاء کے لئے بولے جاتے ہیں۔ جیسے ہاتھ' چہرہ' پنڈلی' مٹھی' وغیرہ —— ان الفاظ سے ہم یہ مراد لیں گے کہ کوئی حقیقت معنوی ہے جس کو ان الفاظ سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اپنے جسموں پر قیاس کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ یا اپنی طرح کا اللہ تعالیٰ کا کوئی چہرہ یا اللہ تعالیٰ کی آنکھ ہم نہیں مان سکتے۔ اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانیت سے پاک ہے' اعلیٰ ہے' ارفع ہے اور منزہ ہے! "سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ" —— البتہ اجمالاً جب یہ الفاظ آئے ہیں تو ہمارا ایمان رہے گا کہ کوئی حقیقت معنوی ہے جس کو ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"اللہ نے آدم کی تخلیق اپنی صورت پر فرمائی ہے" ـــــ اس کو بلا تشبیہ خیال کیجئے۔

اب ایک طرف تو انسان کی عظمتوں کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف قرآن یہ بھی بتاتا ہے : ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾ "انسان کمزور پیدا ہوا ہے" ـــــ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا﴾ "انسان تھڑولا' کم ہمت پیدا ہوا ہے" ـــــ ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ "انسان کی خلقت میں جلد بازی کا مادہ ہے" یعنی جلد بازی اس کی طبیعت اور سرشت میں ودیعت شدہ ہے۔ کہیں فرمایا جاتا ہے : ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ﴾ یعنی انسان کیلئے عورتوں سے دلچسپی اور ان کی طرف شہوت کا میلان' اولاد کی محبت اور مال و اسبابِ دُنیا کی مختلف صورتوں کی طرف بھی ایک کشش ہے جو اس میں طبعی طور پر ودیعت کردی گئی ہے۔ یہ ہے انسان کی حقیقت از روئے قرآن۔

قرآن کا تصورِ فلاح

اب غور طلب اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان کو اپنی ان خامیوں' کمزوریوں' اور اپنی خلقت کے ضعف کے حامل ان پہلوؤں سے کشمکش اور کشاکش کرکے' محنت و مشقت اور ریاضت کرکے اپنی جو اصل بلندی اور رفعت ہے اسے attain کرنا ہے' اس کا جو اصل مرتبہ اور مقام ہے اس کو حاصل کرنا ہے۔ جیسے سورۃ التین میں فرمایا : ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ "ہم نے انسان کو اعلیٰ ترین تخلیق پر پیدا فرمایا' پھر اسے نچلوں میں سب سے نیچے لوٹا دیا' سوائے ان کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے" ـــــ پس اس جدوجہد کا عنوان "ایمان اور عمل صالح" ہے کہ جس کے ذریعے سے انسان اپنی پستی سے ابھر کر اپنے اس مقام بلند تک پہنچتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بالقوہ (Potentially) تخلیق فرمایا ہے۔ اس محنت و مشقت اور اس ریاضت کا نام شریعت' طریقت اور سلوک ہے۔ پستی سے بلندیوں تک پہنچنے کے عمل کے لئے قرآن مجید جامع ترین لفظ استعمال کرتا ہے "فلح" ـــــ اب غور کیجئے کہ اس لفظ کا لغوی مفہوم کیا ہے! ہم عام طور پر اس کا ترجمہ

کر دیتے ہیں کامیابی' بامراد ہونا۔ لیکن فلح (ف ل ح) ــــــ یہ جو عربی زبان میں سہ حرفی مادہ ہے' اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کو توڑنا' پھاڑنا' کسی چیز کو پھاڑ کر اس میں سے کوئی اور چیز بر آمد کرنا ــــــ چنانچہ جیسے ہمارے یہاں کہا جاتا ہے کہ "لوہے کو لوہا کاٹتا ہے" اس طرح عربی زبان کی ضرب المثل ہے : "اِنَّ الْحَدِیْدَ بِالْحَدِیْدِ یُفْلَحُ" ــــــ "لوہا لوہے ہی سے کاٹا جاتا ہے"۔ اسی طرح جدید عربی میں فَلَّاح کسان کو کہتے ہیں' کیونکہ وہ اپنے ہل کی نوک سے دھرتی کے سینہ کو چیرتا ہے۔ ہل اس کا آلہ فلح ہے جس سے کسان' کاشت کار' فلاح زمین میں شگاف ڈالتا ہے۔ اب اس لفظ کو ذہن میں رکھئے اور غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ انسانی شخصیت کے اندر ایک معنوی حقیقت مضمر ہے' جو اس کی اصل شخصیت ہے' جو اس کی خودی ہے' جو اس کی انا ہے۔ کوئی شخص جب "میں" کہہ کر اپنی طرف اشارہ کرتا ہے تو کسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے! غور طلب بات ہے کہ یہ میرا ہاتھ ہے' یہ میرے پاؤں ہیں' یہ میری آنکھیں ہیں' یہ میرے کان ہیں' یہ میرا سر ہے' یہ میرا بدن ہے' تو میں کون ہوں جس کی یہ تمام چیزیں ہیں؟ ــــــ یہ میں' انا' یا خودی انسان کی اصل حقیقت اور اس کی اصل معنوی شخصیت ہے۔ لیکن یہ میں' یا انا' یا خودی چند مادی اور شہوانی غلافوں میں لپٹی ہوئی ہے' جو انسان کے حیوانی وجود کے اندر ودیعت کئے گئے ہیں۔ وہ حیوانی وجود اسے پستیوں کی طرف کھینچتا ہے۔ سارے حیوانی داعیات (Animal Instincts) اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں جو اس کو بلندیوں کی طرف نہیں جانے دیتے بلکہ پستیوں کی طرف کھینچتے ہیں۔ اس سے رُستگاری حاصل کرنا اور اپنے مادی اور شہوانی غلافوں کو پھاڑ کر اس میں سے اپنی اصل معنوی شخصیت کو بر آمد کرنا اور اس کو نشوونما دینا ــــــ یہ عمل فلح ہے۔ جیسے آم کی گٹھلی پھٹتی ہے تو اس میں سے آم کا پودا بر آمد ہوتا ہے اور جیسے ایک بیج شق ہوتا ہے تو اس میں سے پتیاں نکلتی ہیں۔ عربی زبان میں فلح کے بہت ہی قریب کا لفظ "فلق" ہے۔ فلق (ف ل ق) کے معنی بھی پھاڑنا کے ہیں' جو قرآن میں صبح کے لئے آتا ہے۔ سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ کو ﴿ فَالِقُ الْاَصْبَاحِ ﴾ قرار دیا گیا ہے کہ وہ رات کی تاریکی کا پردہ چاک کرتا اور دن کی روشنی بر آمد کرتا ہے۔ اور فرمایا : ﴿ اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی ﴾ "بالتحقیق اللہ دانوں' بیجوں اور گٹھلیوں کو

پھاڑتا ہے اور ان میں سے پودے برآمد کرتا ہے"۔ تو فلاح انسانی کیا ہے؟ یہ کہ انسان کا اپنے مادی اور شہوانی میلانات و رجحانات' اپنے حیوانی تقاضوں اور جبلتوں کے خول کو پھاڑ کر اپنی معنوی شخصیت' اپنی خودی اور اپنی انا کو برآمد کرنا' اس کو پروان چڑھانا اور اس کی تعمیر کرنا —— یہ ہے انسان کی فلاح از روئے قرآن حکیم۔

حکمت چونکہ انسان کی ایک مشترک متاع ہے اس لئے میں یہاں اپنشد کے ایک جملہ کا انگریزی ترجمہ پیش کر رہا ہوں :

"Man in his ignorance identifies himself with the material sheats which encompass his real self."

"انسان اپنی نادانی اور جہالت میں اپنے آپ کو ان مادی غلافوں سے تعبیر کر بیٹھتا ہے جن کے اندر اس کی اصل حقیقت مضمر اور پنہاں ہے اور بایں وجوہ اس کی اصل حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے"۔ قرآن حکیم میں سورۃ الحشر میں فرمایا گیا : ﴿ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ﴾ "اور ان لوگوں کے مانند نہ بن جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے خود انہیں اپنی حقیقت اور اپنی عظمت سے غافل کر دیا"۔

یہ ہے انسان کی انفرادی شخصیت اور سیرت و کردار کی تعمیر کا قرآنی پروگرام اور لائحہ عمل جس کا اصل مقصد فلاح انسانی ہے۔ یعنی انسانی شخصیتوں کے خام مال سے ایک متعیر شدہ اور مستحکم سیرت و کردار وجود میں آئے' جس کا حوالہ علامہ اقبال کے اس شعر میں ہے ؂

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

اور اس سے بھی زیادہ پیارے انداز میں اس بات کو علامہ اقبال نے فارسی میں بایں طور ادا کیا ہے ؂

با نشہ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!

آپ کو معلوم ہے کہ اگر ریت کا ایک گولہ بنا کر اسے آپ کسی شیشہ پر دے ماریں تو شیشہ نہیں ٹوٹے گا' اس کا کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ وہ ریت خود ہی بکھر جائے گی۔ لیکن اسی ریت کو آپ پکالیں' پختہ کرلیں اور وہ اینٹ کی شکل اختیار کرلے تو اب اس کی ضرب کاری اور نتیجہ خیز ہوگی۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے' جن کو علامہ اقبال اپنا مرشد معنوی کہا کرتے تھے' اسی بات کو بڑے سادہ لیکن پُر اثر انداز میں یوں ادا کیا ہے ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل' جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دِلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ' تعمیر نہ کر!

تعمیر سیرت میں صلوٰۃ کی اہمیت

اسلام اور قرآن حکیم انسان کے سامنے جو اعلیٰ نصب العین پیش کرتے ہیں' اس کے حصول کے لئے جو جدوجہد درکار ہے اس کے لئے پہلے پختہ انسانی شخصیتیں ایک ناگزیر ضرورت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ان پختہ شخصیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے جو پروگرام اور لائحہ عمل قرآن مجید تجویز کرتا ہے اس کا اوّل و آخر صلوٰۃ ہے ـــــ ہم نے قرآن حکیم کے اِن دو مقامات پر دیکھا کہ آغاز میں بھی نماز کا ذکر ہے اور اختتام پر بھی نماز ہی کا ذکر ہے۔ میں اس بات کو نبی اکرم ﷺ کی تین احادیث سے واضح کروں گا کہ اسلام کا نقطۂ آغاز نماز ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں : ((بَیْنَ الرَّجُلِ وَ بَیْنَ الْکُفْرِ وَالشِّرکِ تَرْکُ الصَّلَاۃِ)) (صحیح مسلم) "کفر و شرک اور بندے کے درمیان نماز کا معاملہ حائل ہے"۔ یعنی اسلام اور کفر کے مابین امتیاز نماز ہی سے قائم ہوتا ہے ـــــ پھر دیکھئے کسی عمارت کی درمیانی اور اہم شے جس کا عمود ہوتی ہے جس پر چھت کھڑی ہے' جسے ہم ستون کے نام سے جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا : ((اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ)) "نماز دین کا ستون ہے" ـــــ پھر یہ کہ دین کی بلند ترین حقیقت کے بارے میں فرمایا : ((اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤمِنِیْنَ)) "یہ صلوٰۃ مومنین کے لئے معراج کا درجہ رکھتی ہے" ـــــ تو گویا کہ ابتداء بھی' اہم اور درمیانی عمود بھی' اور چوٹی بھی' ان تمام مرحلوں میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ نماز دین کی اہم ترین شے ہے۔ میں اسے یوں تعبیر کروں گا کہ اگر ہم انسان کی سیرت

سازی کو ایک شہر سے تشبیہ دیں تو اس کے گرداگرد جو فصیل کھینچی ہوئی ہے وہ نماز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی اگر دیکھا جائے کہ نماز کو اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں قائم کرلے تو اس کی زندگی گویا کہ ایک حصار میں آجاتی ہے' ایک کھونٹے سے بندھ جاتی ہے۔ پھر اس کے سارے پروگرام اس نماز کے حوالہ سے طے ہوں گے' اس کی appointments اگر ہوں گی تو نماز کے اوقات کو مدنظر رکھ کر ہوں گی' اس کے شب و روز کے معمولات میں فیصلہ کن چیز نماز ہوگی ـــــ لہٰذا پوری انسانی زندگی کو شکنجہ میں کس لینے والی شے نماز ہے۔

"صلوٰۃ" کا مفہوم:

آیئے پہلے ہم یہ سمجھیں کہ "صلوٰۃ" جو قرآن مجید کا اصل لفظ ہے اور "نماز" جو فارسی کا لفظ ہے' ان دونوں کے مفاہیم میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ اب یہ ہماری مجبوری ہے کہ چونکہ ہمارے یہاں اسلام جب پہنچا ہے تو فارسی زبان کے حوالے سے پہنچا ہے لہٰذا اکثر اصطلاحات قرآنیہ کا ترجمہ جو اردو میں مستعمل ہے وہ فارسی الاصل ہے۔ فارسی زبان میں اِن الفاظ کا ایک اپنا مفہوم پہلے سے تھا۔ وہ مفہوم کہیں غیر شعوری طور پر ان اصطلاحات کے اصل مفہوم میں شامل نہیں ہو جانا چاہئے جو قرآن کریم اور ہمارے دین سے مراد ہے ـــــ عربی زبان میں "ص ل ی" کا مادہ (Root) جس سے یہ لفظ صلوٰۃ بنا ہے' اپنے اندر دو بنیادی مفہوم رکھتا ہے ـــــ "اِقدام الی الشیء" کسی کی طرف بڑھنا' کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا ـــــ گویا کہ صلوٰۃ اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے اور متوجہ ہونے کا نام ہے۔ صلوٰۃ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا نام ہے ـــــ اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ چونکہ مکالمہ و مخاطبہ الٰہی سے مشرف کرنے والی چیز ہے لہٰذا یہ حقیقی ایمان کے لئے بمنزلہ "معراج" ہے: "اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤمِنِیْنَ"۔

یہی لفظ "صلوٰۃ" دعا کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی سے دعا کرتا ہے تو وہ اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوتا ہے ـــــ یہی لفظ عنایت و شفقت کے مفہوم میں بھی آتا ہے' جیسے سورۃ الاحزاب میں وارد ہوا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی

النَّبِيِّ ﴾ "بے شک اللہ صلوٰۃ بھیجتا ہے اپنے نبی (ﷺ) پر اور اس کے فرشتے بھی" ـــــ اسی سورت میں آیا ہے : ﴿ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ ﴾ کہ اے اہلِ ایمان اپنے نصیب پر فخر کرو کہ "وہ (اللہ) تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی"۔ اس سے مراد کیا ہے؟ اللہ کی طرف منسوب ہو تو اس کا مفہوم ہو گا اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے عنایت ' شفقت ' رحمت ' توجہ ـــــ فرشتوں کی طرف منسوب ہو کر اس کا مفہوم ہو جائے گا اُن کی طرف سے نبی اکرم ﷺ اور مومنین صادقین کے لئے اللہ کی شفقت ' عنایت ' رحمت اور توجہ کے لئے اُس کے حضور میں دعا ـــــ تو یہ سب باتیں اِس لفظ صلوٰۃ کے پہلے بنیادی مفہوم میں شامل ہیں۔

آپ میں سے اکثر حضرات کو معلوم ہو گا کہ صلوٰۃ کے آغاز کیلئے حدیث میں سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۷۹ کے یہ الفاظ مبارکہ بھی آتے ہیں ﴿ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ ﴾ "میں نے اپنی توجہ کو مرتکز کر لیا ہے اُس ذات کی طرف ' اُس ہستی کی جانب جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں ہر شے سے اپنی توجہ کو ہٹا کر ' یکسو ہو کر اُس (تعالیٰ) کی جناب میں متوجہ ہو رہا ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں"۔ یہ صلوٰۃ کا نقطۂ آغاز ہے۔

صلوٰۃ کا یہ جو مفہوم ہے اس کے اعتبار سے یہ بات ذہن میں رکھئے کہ صلوٰۃ یا نماز کا مقصد ذکرِ الٰہی بنتا ہے۔ صلوٰۃ میں آپ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ' اللہ عزوجل آپ کو یاد آتا ہے۔ اسی لئے سورۂ طٰہٰ میں فرمایا : ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ﴾ "نماز کو قائم کرو ' صلوٰۃ کو قائم رکھو میری یاد کے لئے"۔

اسی لفظ کا دوسرا بنیادی مفہوم ہے "آگ سے حرارت حاصل کرنا ' تاپنا" ـــــ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اہلِ خانہ سے فرمایا تھا : ﴿ اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴾ "میں نے آگ دیکھی ہے ' میں اس کے پاس جا کر کوئی خبر لاؤں گا یا کوئی انگارا لاؤں گا تاکہ تم سردی سے بچنے کے لئے تاپ سکو" (النمل : ۷) اس مفہوم کو بھی مدنظر رکھئے۔ اس کے حوالہ سے حقیقت صلوٰۃ کا یہ پہلو سامنے آنا چاہئے کہ انسان کی روح میں اگر ضعف و اضمحلال پیدا ہو گیا ہو ' اس پر

افسردگی طاری ہو گئی ہو، تو اس میں حرارت تازہ پیدا کرنے کا ذریعہ صلوٰۃ ہے۔ جذبات ایمانی کے متعلق اگر محسوس ہو کہ ان پر کچھ ٹھنڈ طاری ہے یا اوس پڑ گئی ہے تو ان جذبات کے اندر از سرنو ایک حرارت ایمانی کا پیدا کرنا، صلوٰۃ کا مقصد ہے۔ ان دونوں بنیادی مفاہیم اور ان کے ذیلی مفاہیم کو ذہن میں رکھئے تو صلوٰۃ کا جو اصل مطلوب و مقصود ہے، اس کی جو اصل حکمت اور اصل غرض و غایت ہے، وہ سامنے آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے توجہ دلائی ہے کہ اگر یہ باطنی کیفیات موجود نہ ہوں تو پھر نماز محض ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے، اس میں رکوع و سجود تو ہوتا ہے لیکن توجہ اللہ کی طرف ہوتی ہی نہیں۔ وہ ایک جسمانی مشقت تو ہو جاتی ہے لیکن اس کا جو اصل حاصل ہے اس تک انسان کی رسائی نہیں ہوتی۔ علامہ کہتے ہیں ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!

اور

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بُت کدۂ تصورات

توجہ اور انابت الی اللہ کے بغیر فرض عبادات محض رسومات بن کر رہ جاتی ہیں۔ ان کی ادائیگی کی حیثیت رسم پرستی کی رہ جاتی ہے اور جو اصل حقائق و مقاصد ہیں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ جیسے علامہ نے کہا ہے ؎

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی

البتہ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ اس کیفیت میں بھی یہ نماز فائدے سے بالکل خالی نہیں ہے۔ ایک شخص نے اگر اپنا وقت صرف کیا ہے، وہ اپنے کاروبار اور مشغولیات سے نکلا ہے، اس نے وضو کیا ہے، پھر وہ نیت باندھ کر اللہ کے سامنے کھڑا ہو گیا ہے، تو اس نے جو جسمانی مشقت جھیلی ہے آخر اس کا اجر و ثواب تو اسے ملنا چاہئے۔ یہی وقت وہ کاروبار میں لگاتا، یا زندگی کی کسی اور مصروفیت و مشغولیت میں صرف کرتا تو اس سے وہ کوئی

منفعت حاصل کرتا۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا کوئی اجر وثواب نہ ہو ـــــ اجر و ثواب تو ملے گا۔ فرض کی ادائیگی فی نفسہ بہت بڑی بات ہے کہ اس نے اللہ کے ایک حکم پر عمل کیا ہے' امتثال امر بجالایا ہے لیکن نماز کے جو اصل مقاصد ہیں وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ توجہ' انابت' خشوع و خضوع اور وہ حضوری قلب کی کیفیت نہ ہو جو مطلوب ہے ـــــ علامہ اقبال اس کے متعلق جذبات سے مغلوب ہو کر کہتے ہیں ؎

تیرا امام بے حضور' تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر' ایسے امام سے گزر

صلوٰۃ کا ظاہری نظام :

اس صلوٰۃ کا ایک ظاہری نظام ہے۔ اس کی معین ہیئات ہیں' حرکات و سکنات ہیں۔ اس میں تکبیر تحریمہ ہے' ہاتھوں کا اٹھانا ہے' اس میں قیام اور رکوع ہے' پھر قومہ ہے' پھر سجدہ ہے' پھر جلسہ ہے' پھر دوسرا سجدہ ہے۔ اس طرح ایک رکعت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کے مقررہ اوقات ہیں' از روئے الفاظ قرآنی : ﴿ اِنَّ الصَّلٰوۃَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴾ پھر اس میں تعدادِ رکعات کی تعیین ہے۔ مزید برآں نماز باجماعت کا نظام ہے۔ یہ پورا صلوٰۃ کا نظام ظاہری ہے۔ اس کے بارے میں اولاً تو یہ اصل الاصول ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ سارے کا سارا منقول ہے' ماثور ہے' مسنون ہے محمد رسول اللہ ﷺ سے۔ اس کی اصل بنیاد میرا' آپ کا یا کسی اور کا اجتہاد نہیں ہے۔ شخصی اجتہاد پر معاملہ لے آئیں گے تو سب کی نماز علیحدہ علیحدہ ہو جائے گی' یکسانی اور یک رنگی نہیں رہے گی۔ لہٰذا حضور ﷺ نے فرمایا : ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ)) "صلوٰۃ ایسے ادا کرو' نماز ایسے پڑھو' جیسے مجھے دیکھتے ہو کہ میں پڑھتا ہوں"۔

اس صلوٰۃ کے ظاہری نظام کے بارے میں یہ بات بھی جان لیجئے کہ اس میں ہمیں عجیب حکمت یہ نظر آتی ہے کہ اس کے ذریعے سے اسلامی معاشرہ میں اجتماعی سطح پر تطہیر و تنظیم کا ایک نہایت اعلیٰ نظام قائم کیا گیا ہے۔ اجتماعی طور پر نماز ادا ہو رہی ہے' ہر روز

ایک ہی وقت دن میں پانچ مرتبہ مسلمان مساجد میں جمع ہو رہے ہیں۔ اجتماعی ماحول اس کے لئے جزولازم بن گیا ہے۔ پھر اس میں تنظیم کا معاملہ مستقل طور پر ہو رہا ہے۔ محلہ وار تنظیم بھی ہے۔ جمعہ کے دن اس سے بھی بڑی تنظیم ہے۔ عیدین کے موقع پر بڑے بڑے شہروں میں تنظیم ہے۔ حج کے موقع پر پورے کرۂ ارضی سے وہ لوگ جوق در جوق جمع ہو رہے ہیں جو توحید کے ماننے والے ہیں اور جو محمد رسول اللہ ﷺ کے کلمہ گو ہیں ــــــ اس طرح مسلمانانِ عالم کا عالمی اجتماع اور عالمی تنظیم کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اس نظام صلوٰۃ میں اجتماعی تطہیر و تنظیم بھی پیش نظر ہے۔

نظام صلوٰۃ میں محافظت و مداومت کی اہمیت :

نظام صلوٰۃ کے متعلق یہ بات جان لیجئے کہ اس میں اہم ترین چیز محافظت اور مداومت ہے ــــــ اس نظام کو مستقل قائم و دائم رکھنا ہے۔ یہ نہیں کہ جب چاہا نماز ادا کرلی اور جب چاہا گول کردی۔ یا جب جی چاہا نماز پڑھ لی، اوقات کی پابندی نہیں کی گئی، یا بلا کسی عذر اور مجبوری کے گھر میں ہی ادا کرلی، مسجد میں حاضر نہیں ہوئے؟ تو یہ طرزِ عمل اقامت صلوٰۃ کے تقاضوں کے منافی ہے، اس طرح اس کی اجتماعی مصلحتیں اور حکمتیں بالکل ضائع ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس کے لئے "محافظت" اور "مداومت" لازمی ہے ــــــ میں نے یہ دونوں الفاظ اسی سبق سے لئے ہیں۔ سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج میں صلوٰۃ کے لئے جو آخری بات آئی ہے وہ محافظت ہے۔ سورۃ المومنون میں فرمایا : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ ﴾ اور سورۃ المعارج میں فرمایا : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ ﴾ یعنی وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں، اس کا پورا اہتمام کرتے ہیں، اس کے تمام قواعد و ضوابط اور اس کے تمام آداب کی پابندی ملحوظ رکھتے ہیں ــــــ نیز سورۃ المعارج میں فرمایا : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ ۝ ﴾ "وہ لوگ جو اپنی نمازوں میں مداومت یعنی ہمیشگی اور پابندی کرتے ہیں" ــــــ لہٰذا صلوٰۃ کے نظام ظاہری کے ساتھ اقامت، محافظت اور مداومت، ان تین الفاظ کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلیجئے۔

صلوٰۃ کی روحِ باطنی :

آگے چلئے۔ صلوٰۃ کی ایک روح باطنی ہے ـــــ اس کے لئے لفظ "خشوع" آیا ہے : ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ ﴾ "فلاح سے ہمکنار ہوئے وہ اہل ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں"۔ یہاں خشوع سے اصلاً مراد ہے انسان کی معنوی شخصیت کا اپنے رب کے حضور میں جھک جانا۔ ظاہری طور پر تو جسم جھک ہی رہا ہے۔ آپ کھڑے ہوتے ہیں تو اس انداز سے جس میں جھکاؤ ہوتا ہے' سینہ تان کر کھڑے نہیں ہوتے۔ پھر رکوع کرتے ہیں تو مزید جھکاؤ ہو گیا ہے۔ پھر جب سجدے میں گئے تو جھکاؤ کی انتہا ہو گئی۔ لیکن اگر صرف ظاہری طور پر جسم جھک رہا ہو' لیکن وہ معنوی شخصیت' وہ اندر کا انسان' اگر اس کی گردن اکڑی ہوئی ہو' وہ اللہ کے سامنے معنوی طور پر سرنگوں اور Surrender نہ ہو رہا ہو' انسان کا نفس امارہ سرکشی اور تمرد پر تلا ہوا ہو' وہ اللہ کے سامنے نہ جھک رہا ہو تو ظاہری نماز تو ادا ہو گئی' لیکن جو حقیقی نماز ہے وہ ادا نہیں ہو گی۔ اسی لئے اِس سبق میں خشوع کی طرف بھی توجہ دلا دی گئی۔

خشوع و خضوع اور حضورِ قلب وہ باطنی کیفیات ہیں جو مطلوب ہیں' اور اقامت' محافظت اور مداومت یہ وہ چیزیں ہیں جو نظام صلوٰۃ کے ظاہر کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس ظاہر کے ساتھ اسلامی معاشرے کی اجتماعی مصلحتیں وابستہ ہیں اور اس باطنی کیفیات کے ساتھ ایک بندۂ مومن کی اپنی ذاتی سیرت و کردار کی تعمیر اور اس کے ترفع کا مسئلہ متعلق و وابستہ ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے نماز سے وہ اصل اور حقیقی برکات ظاہر ہوتی ہیں جن کا ذکر سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۵ کے درمیان میں فرمایا گیا ہے : ﴿ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۚ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ "بے شک نماز روکتی ہے' بے حیائی اور بری بات سے' اور اللہ کی یاد ہی سب سے بڑی' اعلیٰ اور ارفع بات ہے" ـــــ لیکن اگر اس کے برعکس معاملہ ہو گا تو صلوٰۃ کی ادائیگی کے باوجود معاشرہ اِن برکات سے محروم رہے گا۔

صلوٰۃ کی پابندی : ایمان کا تقاضا

ایک بات اور جان لیجئے کہ نمازوں میں ایک تو فرض نمازیں ہیں اور بقیہ نوافل و سنن ہیں ـــــ فرض نمازیں تو لازم ہیں' ان کو ہر صورت میں ادا کرنا ہے۔ البتہ ان کی

ادائیگی کے لئے خود شریعت ہی نے چند رعایتیں دے رکھی ہیں۔ مثلاً کوئی عذر ہے تو آپ مسجد میں نہ جائیں' نماز گھر میں ادا کرلیں۔ فرض کیجئے آپ بیمار ہیں تو گھر میں پڑھ لیں' اس سے بھی زیادہ معذور ہیں تو لیٹ کر پڑھ لیں' جس میں قیام' رکوع' قومہ' سجدہ' جلسہ' قاعدہ کے لئے اشارات کفایت کریں گے۔ ایسی رعایتیں خود شریعت نے فراہم کردی ہیں۔ لیکن جہاں تک فرض نماز کا قصداً ضائع کردینا ہے تو اس کے بارے میں جان لیجئے کہ یہ گویا حقیقی و قلبی ایمان کا ضائع کردینا ہے ـــــ یہی وجہ ہے کہ ہم نے سورۃ المعارج میں دیکھا کہ وہاں اُس مقام پر لفظ "اَلْمُصَلِّیْنَ" لایا گیا ہے جس مقام پر سورۃ المومنون میں "اَلْمُؤْمِنُوْنَ" کا لفظ آیا ہے : ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ ﴾ اور سورۃ المعارج میں فرمایا : ﴿ اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ ﴾

بہرحال اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ تعمیر سیرت انسانی کے قرآنی پروگرام کا مرکز و محور' اس کا نقطۂ آغاز اور اس کی آخری منزل' یہ سب صلوٰۃ پر مبنی ہیں۔

انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کے ضمن میں جو اساسی پروگرام قرآن حکیم ہمیں دیتا ہے' اس کے جزو اول کے بارے میں' جو اس لائحہ عمل کا اہم ترین جزو ہے' ہم نے سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج کی آیات میں یہ دیکھا کہ دونوں جگہ کامل مطابقت ہے' کہ دونوں مقامات پر اولاً بھی صلوٰۃ کا ذکر آیا اور اختتام بھی صلوٰۃ پر ہوا۔ پھر یہ کہ دونوں مقامات پر صلوٰۃ کی محافظت پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔ سورۃ المومنون میں خشوع و خضوع کی طرف توجہ دلائی گئی اور سورۃ المعارج میں مداومت کی طرف متوجہ کیا گیا۔ ان تمام چیزوں کو جمع کرلیا جائے تو اس سے اقامت صلوٰۃ کی اصطلاح وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ ہم بعد کی سورتوں میں قرآن حکیم میں اسی اصطلاح کو دیکھتے ہیں' مثلاً : "اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ" اور "وَالَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ"۔

اس پروگرام کے دوسرے اور تیسرے اجزاء (اعراض عن اللغو اور زکوٰۃ) کے ضمن میں ہمیں دو باتیں نظر آتی ہیں جن کا دونوں سورتوں میں تذکرہ ہو رہا ہے۔ ان میں ایک تو ترتیب عکسی ہے' یعنی سورۃ المومنون میں پہلے اعراض عن اللغو کا ذکر ہے اور بعد

میں زکوٰۃ اور تزکیہ کا ـــــ جبکہ سورۃ المعارج میں پہلے زکوٰۃ اور تزکیہ کا ذکر ہے اور پھر ایمان بالآخرہ اور ایمان بالقیامہ کا' جس کا اعراض عن اللغو سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان دونوں اوصاف کے بیان میں دونوں مقامات پر تعبیر کے لئے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ قدرے مختلف ہیں اور ان سے ہمیں ان دونوں کی اصل حقیقت اور اصل روح کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

لغو کاموں سے پرہیز

ہم اِس وقت سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات کی ترتیب کے مطابق گفتگو کریں گے۔ اس میں مُفلِحین کا جو دوسرا وصف آیا ہے وہ "اِعراض عَنِ اللَّغو" ہے ـــــ لغو کا مفہوم معصیت یا گناہ نہیں ہے بلکہ وہ کام مراد ہے جو خواہ فی نفسہٖ مباح ہو' اس کی شریعت میں ممانعت نہ ہو' لیکن انسان کو اس کا کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو۔ قرآن مجید انسان کے وقت کی قدر و قیمت کے معاملہ پر بہت زور دیتا ہے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے کہ یہی انسان کا اصل سرمایہ اور راس المال ہے۔ اس وقت ہی سے انسان کو بنتا ہے جو کچھ بھی بنتا ہے اور اس وقت ہی میں بنتا ہے جو کچھ بھی بنتا ہے۔ لہٰذا اس وقت کی قدر و قیمت کا احساس ہونا چاہئے۔ یہ وقت یا تو کسی حقیقی دنیوی ضرورت کو پورا کرنے میں صرف ہو' یا اس کے ذریعہ سے آخرت کے لئے کوئی کمائی کی جائے۔ ہر وہ کام جس سے نہ تو کوئی دنیوی ضرورت حاصل ہو رہی ہو اور نہ اس کے ذریعے انسان آخرت کے لئے کوئی کمائی کر رہا ہو تو ایسا کام "لغو" شمار ہو گا' خواہ وہ ممنوعات کی فہرست میں شامل نہ ہو' وہ حرام و ناجائز نہ ہو' وہ معصیت اور گناہ نہ ہو۔ اس حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے بایں الفاظ بیان فرمایا : ((مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالَا یَعْنِیْهِ)) یعنی انسان کے دین اور اسلام کے حسن و خوبی میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ وہ ہر اُس چیز کو ترک کر دے جو لایعنی ہو' جس کا اسے کوئی فائدہ نہ پہنچ رہا ہو۔ تو ہر لایعنی اور غیر مفید کام کو چھوڑ دینا "اعراض عن اللغو" ہے۔

اب آپ غور کیجئے کہ اصل میں اس کا گہرا تعلق ہمارے تصورِ حیات سے ہے۔ اگر کوئی شخص دنیا کی زندگی کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ بس یہی کل زندگی ہے' کوئی بعث بعد الموت اور آخرت نہیں' کوئی جزا و سزا نہیں' پھر تو ظاہر بات ہے کہ اپنی معاشی ضروریات

سے جو وقت بھی بچ رہا ہو گا وہ اس کا کوئی مصرف تلاش کرے گا کہ کوئی Hobby اور مشغلہ ہو' کوئی Amusement اور تفریح ہو' وقت گزاری (to pass time) کے لئے کوئی شغل ہو۔ لیکن اُس شخص کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے جسے اس بات کا یقین ہے کہ دراصل اس دنیا کی زندگی تو ایک دیباچہ اور مقدمہ ہے' اصل کتاب زندگی تو موت کے بعد کھلے گی : ﴿ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ' لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ٥ ﴾ (العنکبوت : ۶۴) "اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے اصل گھر تو آخرت کا گھر ہے' کاش انہیں معلوم ہوتا"۔ نبی اکرم ﷺ کی بڑی پیاری حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے وہ نتیجہ بیان فرمادیا جو اس حقیقت کے انکشاف سے برآمد ہوتا ہے۔ فرمایا الصادق و المصدوق ﷺ نے : ((اَلدُّنْيَامَزْرَعَةُالْاٰخِرَةِ)) "دنیا آخرت کی کھیتی ہے" —— یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے —— ظاہر بات ہے کہ دنیا کے بارے میں یہ حقیقت منکشف ہونے کے بعد اب اس دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہو گیا۔ ہمیں اس میں بونا ہے تا کہ اسے ہم آخرت میں کاٹ سکیں۔ لہٰذا جس کے دل میں یہ ایمان بالآخرۃ ہو گا وہ اپنے وقت کی جس طرح قدر و قیمت کا احساس کرے گا ایسا اُس شخص کا معاملہ نہیں ہو سکتا جو آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ سورۃ العصر جہاں سے ہمارے اس سلسلۂ درس کا آغاز ہوا' اس میں ہم نے جو پہلا لفظ پڑھا وہ ہے ﴿ وَالْعَصْرِ٥ ﴾ "زمانہ کی قسم ہے"۔ یہ زمانہ تیزی سے گزرا جا رہا ہے۔ یہی تمہارا رأس المال ہے۔ اس کے بارے میں ایک مفسر نے بڑی عبرت انگیز مثال پیش کی ہے کہ برف کا ایک تاجر چلاتا ہے کہ لوگو! رحم کرو! اگر میرا یہ برف فروخت نہ ہوا تو میرا جو رأس المال ہے وہ پگھل جائے گا۔ میں یہ بات ہنری ورڈز ورتھ کی ایک نظم Psalm of life کے حوالے سے بیان کیا کرتا ہوں جس میں شاعر نے اس حقیقت کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے :

Art is long and time is fleeting
And our hearts though stout and brave
Still, like muffled drums are beating
Funeral marches to the grave

اس وقت کی قدر کرو' یہ بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔ اور جس طرح کسی اہم فوجی شخصیت

کا جنازہ ڈھول کی ہر ضرب کے ساتھ قبر سے نزدیک تر ہوتا جاتا ہے اسی طرح ہمارے دل کی ہر دھڑکن گویا ہمیں ہماری قبر سے قریب تر کر رہی ہے۔

یہ احساس اگر سامنے ہو تو معلوم ہو گا کہ وقت کی کیا قدر و قیمت ہے! للذا یہاں تعمیر سیرت کے ذیل میں جو دوسرا وصف بیان ہوا وہ ہے "اعراض عن اللغو" اور اس پر سورۃ المعارج کے ان الفاظ سے روشنی پڑی : ﴿ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ ﴾ "وہ لوگ جو روز جزا کی تصدیق کرتے ہیں"۔ قیامت کے دن کو مانتے ہیں ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ ﴾ "اور وہ لوگ جو اپنے رب کے عذاب کے خیال سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں"۔ اور واقعہ یہ ہے کہ : ﴿ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ ﴾ "بے شک ان کے رب کا عذاب چیز ہی ایسی ہے جس سے بے خوف اور بے فکر ہوا ہی نہیں جا سکتا۔"

زکوٰۃ پر کاربند رہنا

تیسرا وصف سورۃ المومنون میں یہ بیان ہوا : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ ﴾ "اور وہ لوگ جو زکوٰۃ پر کاربند رہتے ہیں" ـــــ میں نے پہلے بھی توجہ دلائی تھی کہ جب قرآن مجید میں زکوٰۃ کا ایک اصطلاح کے طور پر ذکر ہوتا ہے تو اس کے ساتھ فعل اِیتاء آتا ہے مثلاً اِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ 'يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ' اٰتَى الزَّكٰوةَ' اٰتُوا الزَّكٰوةَ ـــــ لیکن یہاں اسلوب مختلف ہے۔ یہاں فرمایا گیا : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ ﴾ ـــــ اس میں ایک تو دراصل زکوٰۃ کی بنیادی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی اور دوسرے یہ کہ "فَاعِلُونَ" فرما کر اس بات کو واضح کیا گیا کہ وہ لوگ یہ عمل مسلسل کرتے رہتے ہیں ـــــ یہاں اس بات کو جان لیجئے کہ زکوٰۃ کا اصل مفہوم اور اس کی بنیادی حقیقت کیا ہے! جیسے "ف ل ح" کے مادے سے ہم نے فلح کا مفہوم سمجھا تھا ایسے ہی "ز ک ی" کے حوالے سے ہمیں اس کا اصل مفہوم سمجھنا ہو گا۔ اسے آپ ایک مالی کے عمل پر قیاس کر کے بخوبی سمجھ سکیں گے جس نے ایک باغیچہ لگایا ہے' جس میں کچھ پودے اُس نے خود لگائے ہیں جو پھل دار ہیں' یا پھول دار ہیں۔ لیکن اسی باغیچہ میں خود رَو گھاس اور کچھ

جھاڑ جھنکاڑ بھی اپنے آپ اُگ آتا ہے اور یہ خود رَو گھاس یا جھاڑ جھنکاڑ اِن پودوں کے نشوونما میں رکاوٹ بنتا ہے۔ زمین میں جتنی قوت نمو ہے اسے اگر یہ خود رَو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ نہ کھینچ رہے ہوں تو یہ ساری قوت نمو اُن پودوں کو ملے گی جو اس مالی نے خود لگائے ہیں' ورنہ یہ گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ بھی اس میں سے اپنا حصہ وصول کریں گے۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ یہ خود رو چیزیں ان پودوں کے لئے ہوا کی آکسیجن اور سورج کی تمازت حاصل کرنے سے رکاوٹ بن رہی ہوں۔ لہٰذا مالی اپنے کھرپے کے ذریعے سے' جو ہر وقت اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے' اس باغیچہ کے اندر سے تمام خود رو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ کو علیحدہ کردے گا۔ مالی کا یہ عمل "تزکیہ" ہے۔ چنانچہ اس کا اصل مفہوم یہ ہوا کہ کسی شے کی نشوونما میں جو رکاوٹ ہو اس کو دور کر دینا تزکیہ ہے۔

اب اس بات کو جان لیجئے کہ ہر انسان' ہر فرد نوع بشر اللہ تعالیٰ کی کیاری کا ایک پودا ہے جو اس نے لگایا ہے۔ چنانچہ اللہ چاہتا ہے کہ یہ پروان چڑھے' پھلے پھولے' اس میں جو استعداد ات اللہ نے ودیعت کی ہیں وہ پورے طور پر بروئے کار آئیں اور نشوونما پائیں۔ اس طرح انسان اپنے اس اصل مقام کو حاصل کرلے جس کے لئے اللہ نے اسے بالقوہ (Potentially) تخلیق فرمایا ہے۔ لیکن کچھ چیزیں اس کی اس نشوونما میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ "ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں" کے مصداق ان تمام چیزوں کو جمع کریں گے تو وہ ہے دنیا کی محبت۔ چنانچہ آپ قرآن مجید میں بار بار دیکھیں گے کہ جہاں انسان کی گمراہی اور بے راہ روی کے اصل سبب کی تشخیص ہوتی ہے وہاں عموماً یہ بات آئے گی : ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ○﴾ (الاعلیٰ : ۱۶' ۱۷) "تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو' حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی"۔ کہیں فرمایا جاتا ہے : ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ○ وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ○﴾ ہم سورۃ القیامہ کے درس میں ان آیات کا مطالعہ کرچکے ہیں کہ تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ تمہارے دل حب عاجلہ میں گرفتار ہو گئے ہیں اور تم آخرت کو نظر انداز کرتے ہو ــــــ اور عاجلہ سے مراد یہ دنیا ہے۔

اب ذرا ایک قدم اور آگے آیئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس حب دنیا کا

سب سے بڑا نشان' اس کی سب سے بڑی علامت (Symbol) حب مال ہے۔ سورۃ الفجر میں فرمایا : ﴿ وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ ﴾ "تم مال سے بڑی محبت کرتے ہو اور تم پر اسے جمع کرنے کی دُھن سوار رہتی ہے"۔ اور سورۃ الھمزۃ میں فرمایا : ﴿ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَہٗ ۝ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗٓ اَخْلَدَہٗ ۝ ﴾ "(تباہی ہے اس شخص کے لئے) جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے دوام بخشے گا"۔ پس یہ مال کی محبت ہی انسان کے اخلاقی ارتقاء اور اس کی اعلیٰ اقدار کی نشو و نما میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جس رُخ پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان کی شخصیت ترقی اور نشو و نما پائے' اس کا ارتقاء ہو' اس کی تعمیر ہو' اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی مال کی محبت ہے ـــــ لہٰذا اس مال کی محبت کو دل سے کھرچنے کے لئے نسخہ انفاق مال ہے۔ یعنی مال کا اللہ کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لئے خرچ کرنا ـــــ وہ خیرات و صدقات کی صورت میں محتاجوں' مسکینوں' یتیموں' بیواؤں کی مدد میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ قرابت داروں کا حق ادا کرنے میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ پیغام الٰہی کی نشر و اشاعت کے لئے صرف ہو رہا ہو۔ وہ دین کی سربلندی اور غلبہ کے لئے اور اس کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کے لئے صرف ہو رہا ہو۔ یہ ہے اصل میں "عمل تزکیہ" ـــــ یہ کرتے رہو گے تو دل سے مال کی محبت ختم ہو گی' جو اصلاً علامت ہے حب دنیا کی۔ اور حب دنیا کا یہ بریک (Brake) اگر کھل گیا' اس کی گرفت ختم ہو گئی تو اب تمہاری گاڑی پوری رفتار کے ساتھ اس شاہرہ پر چلے گی کہ جس پر چل کر تم تعمیر ذات' تعمیر خودی' تعمیر شخصیت اور تعمیر سیرت و کردار کے باب میں ترقی کر سکو گے۔

اب اس ارتقاء و ترقی کے لئے قرآن مجید نے ایک دو گونہ پروگرام بتایا ہے ـــــ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ صلوٰۃ میں وہ نماز بھی شامل ہے جو فرض ہے' جس کو آپ نے ہر حالت میں ادا کرنا ہے' جس کے لئے روزانہ پانچ فرض نمازوں کا نظام موجود ہے' اور اس کے ساتھ ہی نفل نمازیں بھی صلوٰۃ کے زُمرے میں شامل ہیں ـــــ اسی طرح اس زکوٰۃ کے عمل کے بھی دو اجزاء کر دیئے گئے۔ ایک "زکوٰۃ" تو لازم اور فرض ہو گئی

اور اس کے لئے ایک خاص حد معین کر دی گئی ہے جسے "نصاب" کہا جاتا ہے۔ یعنی مالی حیثیت سے اس سے زائد جو بھی ہے اس پر شرح نصاب کے مطابق لازماً رقم لے لی جائے گی۔ اس کی ادائیگی فرض ہے۔ اس کو اصطلاحاً زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

لیکن عمل تزکیہ تو دائم ہے۔ اس میں صرف زکوٰۃ مفروضہ ہی نہیں' بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مزید انفاق مال کی ترغیب ہے۔ جیسے ہم آیۂ بر میں پڑھ چکے ہیں : ﴿ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ' وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ﴾ ـــــ یہاں فرض زکوٰۃ کا علیحدہ سے ذکر ہے اور اس سے پہلے ذکر کیا گیا کہ "اس نے مال محبوب ہونے کے باوجود اسے قرابت داروں' یتیموں' مساکین' مسافروں' سوال کرنے والوں اور گردنوں کے چھڑانے میں خرچ کیا" ـــــ لہٰذا مطلوب یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ اور دو' بڑھ چڑھ کر دو ـــــ اس کی جب آخری حد پوچھی گئی کہ حضور ﷺ کہاں تک دیں؟ تو قرآن مجید میں اس کی وضاحت فرمائی گئی : ﴿ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ' قُلِ الْعَفْوَ ﴾ "یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں! تو (اے نبی!) ان سے کہئے جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہے اسے دے ڈالو"۔ پھر مزید تشویق و ترغیب کیلئے فرمایا : ﴿ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ﴾ "تم نیکی (کے بلند ترین مقام) تک نہیں پہنچ سکو گے جب تک کہ اللہ کی راہ میں وہ چیز صرف نہ کرو جو تمہیں محبوب ہے" ـــــ اب یہ ہے وہ عمل تزکیہ جس کی ترغیب و تاکید قرآن مجید میں بار بار آتی ہے۔ آخری پارے کی سورۃ الشمس میں نفس انسانی کے بارے میں فرمایا گیا : ﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○ ﴾ "گواہ ہے یہ نفس انسانی اور جو اللہ نے اسے بنایا اور سنوارا (اور اس میں طرح طرح کی صلاحیتیں اور بہت سی استعدادات ودیعت فرمائیں۔) پھر اس میں نیکی اور بدی کا شعور بھی الہامی طور پر پیدا فرمادیا۔ تو جس کسی نے اس کا تزکیہ کرلیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے خاک آلود کردیا وہ ناکام و نامراد ہوا" ـــــ یہی بات ہم سورۃ الاعلیٰ میں دیکھتے ہیں : ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ○ وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی ○ ﴾ "کامیاب ہوگیا وہ شخص جس نے تزکیہ حاصل کرلیا اور اس نے اپنے رب کے نام کا ذکر

کیا اور نماز ادا کی" ـــــ سورۃ الاعلیٰ کی یہ دو آیتیں سورۃ المومنون کی ان آیات سے بہت مشابہ ہیں : ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ ﴾

تو یہ تھے تعمیر سیرت کے قرآنی پروگرام کے دوسرے اور تیسرے اجزاء ـــــ یعنی ایک "اِعْرَاض عَنِ اللَّغو" جس کا براہ راست تعلق ایمان بالآخرہ اور ایمان بالقیامہ سے ہے' اور دوسرے تزکیہ پر مسلسل عمل پیرا رہنا۔ اسی کے لئے سورۃ المعارج میں یہ الفاظ آئے : ﴿ وَالَّذِیْنَ فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ ﴾ "وہ لوگ کہ جن کے اموال میں حق ہے' جو جانا پہچانا ہے' سائل کے لئے بھی اور محروم کے لئے بھی"۔

جنسی جذبہ پر قابو رکھنا

اب ہم سورۃ المومنون کی آیات ۵ تا ۷ پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ یہ تینوں آیات بعینہٖ انہی الفاظ میں سورۃ المعارج (آیات ۲۹ تا ۳۱) میں بھی وارد ہوئی ہیں :

﴿ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ ﴾

"اور وہ لوگ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں اور باندیوں کے' پس ان کے معاملہ میں ان پر کوئی ملامت نہیں۔ پھر جو کوئی اس سے تجاوز کرے گا تو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے"۔

تعمیر سیرت کے جس قرآنی پروگرام کا ہم سورۃ المومنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور سورۃ المعارج کی آیات ۱۹ تا ۳۵ کے حوالے سے مطالعہ کر رہے ہیں اس میں چوتھا وصف یا اس کا چوتھا جزو جنسی جذبہ پر قابو رکھنا ہے ـــــ یہ بات اپنی جگہ اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ انسان میں جو مختلف قسم کے حیوانی میلانات اور داعیات ہیں ان میں سے ایک اہم میلان جنسی جذبہ بھی ہے۔ انسان کا پیٹ کھانے کو مانگتا ہے' اس سے اس کی اپنی زندگی کا تسلسل وابستہ ہے۔ اسی طرح تمام حیوانات میں اپنے نسلی تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے فاطر فطرت نے جنسی جذبہ ودیعت کیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے

لگایا جا سکتا ہے کہ دورِ جدید کے ایک بہت بڑے ماہر نفسیات فرائڈ نے جنسی جذبہ کو انسان کے محرکات عمل میں سب سے زیادہ قوی جذبہ قرار دیا ہے۔ ہم اگرچہ اس کو تسلیم نہیں کرتے' ہمارے نزدیک یہ اس کا مغالطہ ہے' اس کی نگاہ میں ایک چیز بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ اور انسانی فکر کا یہ خاصہ ہے کہ بسا اوقات کوئی ایک چیز انسان کے ذہن پر اس طرح مسلط ہو جاتی ہے کہ باقی تمام چیزیں اسے اس کے تابع نظر آنے لگتی ہیں۔ یہی معاملہ فرائڈ کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اپنی جگہ پر جنسی داعیہ ایک بہت بڑا محرک اور نہایت قوی جذبہ ہے۔

اس ضمن میں اگر ہم تاریخ انسانی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں انسانوں میں افراط و تفریط کی دو انتہائیں نظر آتی ہیں ـــــ ایک طرف انسان نے اس جذبہ کو فی نفسہ شر قرار دیا کہ یہ ہے ہی سر تا سر برائی' یہ برائیوں کی ماں ہے۔ اسی لئے ہمیں ایک بہت بڑے طبقہ میں یہ خیال ملے گا کہ جنسی جذبہ فی نفسہ شر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مذاہب میں روحانی ترقی کا راستہ تجرد کی زندگی کے ذریعہ سے اختیار کیا گیا کہ ساری عمر شادی بیاہ نہ کیا جائے' گھر گرہستی کا کھکیڑ نہ پالا جائے' اس لئے کہ یہ راستہ ہے ہی برائی کا' اس میں کوئی خیر ہے ہی نہیں۔ یہ رہبانیت کا نظریہ ہے جو دنیا میں مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے رائج رہا ہے۔

اس ضمن میں دوسری انتہا یہ ہوئی کہ اپنے اس جنسی جذبہ کی آزاد اور بے قید طریق سے تسکین کرنا' اس میں حلال و حرام کی کوئی تمیز نہ کرنا اور صحیح و غلط کے فرق و امتیاز کو ملحوظ نہ رکھنا' جیسے خیالات کو روا رکھا گیا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نوعِ انسانی جن بہت بڑی بڑی گمراہیوں میں مبتلا ہوئی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ جذبہ Pervert ہو کر' یعنی کج رو ہو کر فطرت کی جو ایک معین راہ ہے اس کی بجائے دوسرے راستے اختیار کرتا ہے۔ تو تاریخ انسانی میں یہ دو انتہائیں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔

ان آیات میں قرآن مجید کا جو متوازن بیان ہمارے سامنے آتا ہے اس کے متعلق یہ بات اہم ہے کہ تین تین آیات دونوں مقامات پر (سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج میں) اس شان سے وارد ہوئی ہیں کہ ایک شوشے تک کا فرق نہیں ہے' اور جیسا کہ ہم آخر میں

دیکھیں گے کہ یہاں سات اوصاف زیر بحث آئے ہیں جن میں سے تین پہلے ہیں، تین بعد میں ہیں، مرکزی بحث یہی ہے۔ پھر اس مسئلہ پر دونوں مقامات پر تین تین آیات وقف کی گئی ہیں۔ تو اس سے اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان آیات میں ہمارے سامنے جو متوازن بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر قانون شریعت کے دائرہ میں رہ کر حلال پر اکتفا کرتے ہوئے ایک انسان اپنے فطری جذبہ کی تسکین حاصل کرتا ہے تو فرمایا گیا: ﴿فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ﴾ اس میں کوئی ملامت کی بات نہیں ہے، اس میں فی نفسہ کوئی برائی نہیں ہے۔ بلکہ حضور ﷺ نے تو صاف طور پر فرمایا: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ)) "اسلام میں رہبانیت بالکل نہیں ہے"۔ اس کے برعکس آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ)) نکاح کرنا، شادی بیاہ کرنا، گھر گرہستی کی زندگی اختیار کرنا میرا طریقہ ہے، یہ میری سنتوں میں سے ایک سنت ہے ـــــ لہٰذا تعمیر سیرت اور اخلاقی ترفع حاصل کرنے کے لئے ترک دنیا والی روش اسلام کی روش نہیں ہے، وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت نہیں ہے۔ وہ حضور ﷺ کا طریقہ نہیں ہے۔

لیکن دوسری طرف اس کے لئے حد بندیاں کر دی گئیں۔ دوسرے ناجائز راستے بند کر کے نکاح کا جائز راستہ کھول دیا گیا کہ اس راستہ سے انسان اپنے جذبہ کی تسکین حاصل کرے۔ اس کے لئے حدیث میں یہاں تک فرمایا گیا کہ ایک بندۂ مومن کے لئے یہ عمل بھی عبادت کا ایک جزو بن جاتا ہے، جب کہ یہ فعل اس قاعدہ، اس ضابطہ اور قانون کے تابع رہ کر ہو رہا ہو جو اللہ نے اس کے لئے معین فرما دیا ہے۔

اسلام میں ملک یمین کی حیثیت

ان آیات میں ضمنی طور پر ایک مسئلہ ایسا بھی سامنے آیا ہے جس کے بارے میں بہت سے سوالات ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے جو قانونی راہ ہے اس کو بیان کرتے ہوئے قرآن مجید دونوں مقامات پر ﴿إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ﴾ کے الفاظ استعمال کر رہا ہے۔ یعنی بیویوں کا ذکر بھی ہے اور باندیوں یا لونڈیوں کا بھی۔ یہ معاملہ بہت پیچیدہ بھی ہے اور بڑا تفصیل طلب بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ

اس ضمن میں چند باتیں اچھی طرح ذہن نشین کرلی جائیں تو ان شاء اللہ تمام اشکالات رفع ہو جائیں گے۔

پہلی بات یہ ہے کہ لونڈیوں یا غلاموں کا ادارہ (Institution) اسلام کے اپنے نظام کا کوئی جزو لازم نہیں ہے۔ لونڈی یا غلام رکھنا فرائض میں سے ہے نہ واجبات میں سے۔

دوسری بات یہ کہ جس وقت قرآن مجید نازل ہوا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ ہوئی تو معاشرہ میں یہ ادارہ بالفعل موجود تھا' اور جیسے بہت سی دوسری چیزیں ایسی تھیں جو اصلاح طلب تھیں ویسے ہی یہ ادارہ بھی اصلاح طلب ادارہ کی حیثیت سے موجود تھا۔ جس طرح اسلام نے دوسری چیزوں میں اپنے اصلاحی پروگرام کو تدریجی طور پر آگے بڑھایا' ایسے ہی اس معاملہ میں بھی اسلام نے بہت سی اصلاحات نافذ کیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا اجراء فرمایا۔ سب سے پہلی اصلاح یہ ہوئی کہ یہ بات بار بار فرمائی گئی کہ یہ لونڈی غلام تمہارے ہی بھائی بند ہیں۔ یہ صرف ایک relationship ہے جو دنیا میں تمہارے اور ان کے مابین قائم ہو گئی ہے' جیسے ایک آجر (employer) ہے اور ایک مستاجر (employee) ہے لیکن بحیثیت انسان دونوں برابر ہیں۔ پس اگر یہ اونچ نیچ کہیں چلی آ رہی ہے کہ کوئی آقا ہے اور کوئی غلام ہے تو بحیثیت انسان وہ مساوی ہیں۔ لہٰذا آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جو کچھ تم خود کھاتے ہو اپنے غلاموں کو وہی کچھ کھلاؤ' اور جو کچھ تم خود پہنتے ہو وہی ان کو پہناؤ۔ ان کے ساتھ محبت' شفقت اور حسن سلوک رکھو۔ ایک طرف تو یہ اخلاقی تعلیم جس کے ذریعہ سے ان کی تالیف قلبی کی گئی۔ یعنی وہ انسان جو گرے ہوئے تھے' دبے ہوئے تھے' پسے ہوئے تھے' نبی اکرم ﷺ نے ان کو اس حالت سے اٹھا کر آزاد انسانوں کے برابر لانے کی کوشش فرمائی۔ اس کی دشمن بھی گواہی دیتے ہیں۔ ایچ جی ویلز' جو حضور ﷺ سے بہت دشمنی رکھتا ہے' وہ بھی گواہی دیتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے یہ پروگرام واقعتاً روبعمل لا کے دکھایا۔

تیسری بات یہ کہ اسلام نے ان کی آزادی کا ایک راستہ کھول دیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں مکاتبت کا حکم آیا۔ یعنی اگر کوئی غلام اپنے آقا سے یہ معاہدہ کرلے کہ میں اتنی رقم

(اپنی آزادی کی قیمت کے طور پر) تمہیں ادا کردوں گا تو اس آقا کو ازروئے شریعت پابند کیا گیا ہے کہ وہ اس غلام کے ساتھ معاہدہ کرے۔ اب وہ غلام محنت کر کے کمائی کرے اور طے شدہ رقم اپنے آقا کو دے دے تو وہ آزاد ہو جائے گا۔ اس معاملہ میں کوئی آقا انکار نہیں کر سکتا کہ میں تمہارے ساتھ یہ معاہدہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ان کی آزادی کے لئے پہلی شکل یہ اختیار کی گئی۔ چنانچہ فرمایا گیا : ﴿ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ..... ﴾ (النور : ۳۳) "اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں ان سے مکاتبت کرلو...."۔ ﴿ فَكَاتِبُوْهُمْ ﴾ فعل امر ہے اور امر وجوب کے لئے بھی آتا ہے۔ پھر تمام مسلمانوں حتیٰ کہ ان کے آقاؤں کو بھی تلقین کی گئی کہ تم اس معاملہ میں ان کے ساتھ تعاون کرو اور صدقہ و خیرات سے ان کی مدد کرو۔ چنانچہ اسی آیت میں جس میں مکاتبت کے لئے حکم آیا ہے آگے چل کر فرمایا : ﴿ وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ﴾ "اور دو ان کو اللہ کے مال میں سے جو اس نے تم کو دیا ہے۔" یہاں یہ نکتہ بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ انسان کے پاس جو مال ہے اس کی ملکیت حقیقی کی نسبت اللہ تعالیٰ اپنی طرف فرما رہا ہے۔ یہ دوسری شکل ہے جو قرآن مجید نے اختیار کی۔ اس طرح ان کی تالیف قلبی' ان کے رتبہ کی بلندی اور ان کی آزادی کی راہ نکلی۔

پھر آپ کو یاد ہو گا کہ مطالعہ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے دوسرے سبق میں ہم نے حقیقی نیکی کو سمجھنے کے لئے سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۷۷ کا مطالعہ کیا تھا' جسے میں "آیت البر" سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ وہاں گردن چھڑانے یعنی غلاموں کی آزادی کے عمل کو اعلیٰ ترین نیکی کے کاموں میں شمار کیا گیا ہے۔ پھر سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۶۰ میں صدقات واجبہ یعنی زکوٰۃ کے مستحقین کی جو آٹھ مدات مقرر فرمائی گئی ہیں' ان میں بھی گردن چھڑانے یعنی غلاموں کی آزادی کے لئے زکوٰۃ سے رقم ادا کرنے کی مد بھی شامل ہے۔ مزید یہ کہ سورۃ البلد میں بڑے پیارے انداز میں غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ فرمایا : ﴿ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ○ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ○ فَكُّ رَقَبَةٍ ○ ﴾ "انسان گھاٹی کو عبور کر نہیں پاتا اور تم جانتے ہو کہ وہ گھاٹی کون سی ہے!" اس گھاٹی کی جب تفصیل بیان کی گئی تو سب سے پہلے ذکر ہوا : "فَكُّ رَقَبَةٍ" یعنی "کسی گردن کو آزاد

کرا دیتا" ــــ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دفتر فضائل کا ایک درخشاں باب یہ بھی ہے کہ آپؓ نے غلاموں اور کنیزوں کے طبقے میں سے اسلام قبول کرنے والے چھ مسلمانوں کو' جن میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں' ایک خطیر رقم دے کر خریدا اور ان کو آزاد کیا ــــ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ میں جس روز سے ایمان لایا ہوں (اور اندازہ کیجئے کہ آپؓ سابقون الاولون میں سے ہیں' ایمان لانے والوں میں آپؓ کا چھٹا نمبر ہے) اُس روز کے بعد سے کوئی جمعہ مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے ایک غلام آزاد نہ کیا ہو' اور اگر اتفاقاً کسی جمعہ کو میرے لئے یہ ممکن نہ ہوا تو اگلے جمعہ کو میں نے دو غلام آزاد کئے یا کرائے ــــ پھر شریعت کے احکام کی بعض فروگذاشتوں کے کفارہ کے طور پر ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا یا کرانا قرار دیا گیا ــــ تو یہ ہیں وہ تدابیر جو اسلام نے اس مسئلہ کی اصلاح کے لئے اختیار کیں۔

اس تیسری بات کے ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ اسلام نے اس بات کو سب سے بڑے گناہوں یعنی کبائر میں سے قرار دیا ہے کہ کسی آزاد انسان کو پکڑ کر غلام بنا لیا جائے ــــ اسلام میں صرف ان لوگوں کو غلام اور لونڈی بنایا گیا ہے جو خالص قتال فی سبیل اللہ کے نتیجہ میں محاذ جنگ پر گرفتار ہوتے تھے۔ ان کو کبھی فدیہ لے کر' کبھی بطور احسان اور کبھی مسلمان قیدیوں کے تبادلہ میں رہا کر دیا جاتا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی صورت مصالح دینی کے لحاظ سے مناسب نہ ہو تو ان کو مسلمان معاشرہ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور اسلام نے ان کے لئے حسن سلوک کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات دی ہیں۔

اس وقت دنیا میں جو سب سے زیادہ متمدن اور مہذب ترین مملکت کہلاتی ہے' یعنی امریکہ' اس میں جو کالے ہیں وہ بھلا کون ہیں؟ انہیں افریقہ سے اس طرح پکڑ کر جس طرح شکاری گھات لگا کر شکار کو زندہ پکڑتے ہیں' جہازوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح لاد کر بطور غلام امریکہ لے جایا گیا۔ وہاں ان کی خرید و فروخت ہوتی تھی' حالانکہ وہ اپنے ملک کے آزاد باشندے تھے۔ اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ بعد میں امریکی سوسائٹی نے کسی حد تک اپنے آباء و اجداد کے اس جرم کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ابراہیم لنکن کی عظمت تسلیم کی جانی چاہئے۔ لیکن امریکن ذہن اب بھی کالوں کو اپنے برابر سمجھنے

کے لئے تیار نہیں ہیں۔ نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ تاریخ میں یہ کچھ بھی ہوا اُن لوگوں نے کیا ہے جو صدیوں سے بڑے متمدن اور مہذب ہونے کے مدعی چلے آ رہے ہیں' جبکہ اسلام نے اس کو ایک بہت بڑا گناہ قرار دیا ہے کہ آپ کسی آزاد کو پکڑ کر غلام بنا لیں۔

اب میں چوتھی بات یہ عرض کروں گا کہ اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ غلامی کی قطعی و حتمی منسوخی (Final Abolition) کی کوئی آیت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ جیسے کہ ہم شراب کے بارے میں دیکھتے ہیں کہ ابتدا میں حکم آیا کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ تدریجاً اصلاح کا قدم اٹھایا گیا' اور بالآخر وہ وقت آگیا کہ فرمایا گیا : ﴿ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴾ "پس کیا تم (اس سے) باز آتے ہو کہ نہیں؟" ——— اور ﴿ فَاجْتَنِبُوْهُ ﴾ "اب اس سے باز آجاؤ" ——— اسی طرح سود کی سب سے پہلے سورۃ الروم میں اخلاقی سطح پر مذمت کی گئی۔ پھر سورۂ آل عمران میں سود دَر سود سے منع کیا گیا۔ پھر حرمت کی آخری آیت ۹ھ میں حضور ﷺ کے انتقال سے کچھ عرصہ قبل نازل ہوگئی' جو سورۃ البقرۃ میں ہے اور جس میں ہر نوع کا سود حرام مطلق قرار دے دیا گیا۔ لیکن غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں اس نوعیت کا کوئی حکم قرآن مجید میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں یہ ادارہ کچھ عرصہ تک چلتا رہا ہے۔

اب آپ یہ ہدایات پیش نظر رکھئے کہ جو خود کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ' جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ پھر یہ کہ ان کی گردنوں کو چھڑانے کے لئے اخلاقی تعلیمات بھی موجود ہوں' جیسے ﴿ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴾ اور صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ میں گردنیں چھڑانے کی مستقل مد رکھ دی گئی ہو۔ تو ان اسلامی تدابیر کا نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام میں وہ دَور بھی آیا کہ مشرق و مغرب میں عظیم ترین مملکتیں ان کی تھیں جن کو ممالیک اور غلام کہتے ہیں۔ ہندوستان میں جو خاندان غلاماں حکمران تھا اور مصر میں جو ممالیک کی حکومت تھی تو یہ اُس اصلاحی عمل (Reform) کا نتیجہ ہے جس کا آغاز حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ غلاموں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ غلامی سے اٹھا کر شہنشاہی تک پہنچا دیا۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ غلام تخت ہند پر متمکن ہے۔ وہ چاہے قطب

الدین ایبک ہو یا شمس الدین التمش جیسا درویش صفت اور ولی اللہ بادشاہ ہو۔ اسی طرح آپ کو دَورِ خلفائے راشدینؓ دَورِ بنو اُمیہ اور دَورِ بنو عباس میں علوم دین کی مسندوں پر بہت سے ایسے اکابر جلوہ افروز نظر آئیں گے جو آزاد کردہ غلاموں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے' اور جن کی جوتیاں سیدھی کرنا اور اٹھانا بنو امیہ اور بنو عباس کے باجبروت بادشاہوں کے شہزادگان اپنے لئے بہت بڑی سعادت خیال کرتے تھے۔

لیکن بہرحال اگر حکمت خداوندی نے اس کی آخری تنسیخ نہیں کی —— اور کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی ہے جو اِس ادارہ کو حتمی و قطعی طور پر منسوخ قرار دیتی ہو —— تو ہمیں بحیثیت مسلمان اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ پر ایمان و اعتماد رکھنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں ہے کہ کہیں معاذ اللہ ثم معاذ اللہ نسیان سے یہ بات رہ گئی ہو۔ ﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴾ یہ معاذ اللہ کسی بھول چوک سے نہیں ہوا۔ ہمیں بہرحال اپنے علم سے اللہ کے علم کو مقدم رکھنا ہے۔ کہاں ہماری عقل اور کہاں ہماری منطق! کہاں ہمارے فلسفے! جو انتہائی کوتاہ اور محدود ہیں اور کہاں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں!! تو وہ جو اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور حکمت کاملہ ہے یقیناً یہ اسی کا ظہور ہے کہ قرآن مجید میں اس کی آخری درجہ میں تنسیخ نہیں آئی ——!!!

تعمیر سیرت کے لئے آخری تین اوصاف

زیر نظر درس میں انسان کی انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے اللہ تعالیٰ نے سات نکات پر مشتمل جو لائحہ عمل عطا کیا ہے' اب ہم اس کے آخری تین اوصاف کا مطالعہ کریں گے۔ اس لائحہ عمل کا اولین اور اہم ترین نکتہ اِقامة الصلٰوۃ ہے' دوسرا فعل الزکٰوۃ' تیسرا اِعراض عنِ اللغو' اور چوتھا ضبط نفس یعنی جنسی جذبے پر قابو یافتہ ہونا۔ اس لائحہ عمل کے آخری تین اوصاف یہ ہیں۔ (۱) امانت کی پاسداری (۲) ایفائے عہد (۳) اپنی شہادتوں پر قائم رہنا۔

اب اگر آپ ایک خاص اعتبار سے غور کریں گے تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ پہلے تین اوصاف کا تعلق ایک شخص کی اپنی ذات کے ساتھ ہے' کوئی دوسرا شخص ان سے

متعلق نہیں ہوتا۔ نماز کو قائم رکھنا' بے کار اور بے مقصد باتوں سے اعراض' اللہ کی راہ میں خرچ کرنا' یہ تو خالص ذاتی نوعیت کے اوصاف ہیں۔ چوتھا وصف وہ تھا کہ جس پر انسانی تمدن کی صحت کا دارومدار ہے۔ اس لئے کہ انسانی تہذیب و تمدن میں خاندان کے ادارے کو جڑ اور بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ عائلی زندگی اور خاندان کے ادارے کی صحت اور استحکام کا دارومدار اس پر ہے کہ انسان اپنے جنسی جذبہ پر قابو اور ضبط رکھتا ہو' اسے کسی غلط رُخ پر نہ پڑنے دے۔

اب جو آخری تین اوصاف ہیں جن پر ہمیں اجمالاً گفتگو کرنی ہے' ان کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی کی اس سطح سے ہے جسے ہم ملی اور سیاسی زندگی کہتے ہیں۔ یعنی حکومت کا نظام' نظامِ مملکت' قومی و ملی معاملات۔ اس ضمن میں آپ دیکھیں گے کہ تین اوصاف نہایت ضروری ہیں۔ ان میں سب سے پہلا وصف امانتداری اور دوسرا ایفائے عہد ہے۔

امانت داری اور پاسِ عہد کا ذکر سورۃ المعارج میں بھی ہے اور سورۃ المومنون میں بھی۔ اور دونوں جگہ پر ایک شوشے کے فرق کے بغیر بعینہٖ یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں :
﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ ﴾ امانت داری اور ایفائے عہد کے مابین جو ربط و تعلق ہے اور ان کی جو اہمیت ہے وہ ہمیں نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ سے بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو مسلسل دس برس تک حضور ﷺ کے خادم خاص رہے ہیں' اور اس کو روایت کیا ہے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ : قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا قَالَ "شاذ ہی کبھی ایسا ہوا ہو گا کہ آنحضور ﷺ نے کوئی خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں آپؐ نے یہ الفاظ نہ فرمائے ہوں": ((لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ)) "جس میں امانت داری کا وصف نہیں ہے اس کا کوئی ایمان نہیں ہے' اور جس میں ایفائے عہد کا وصف نہیں ہے اس کا کوئی دین نہیں ہے" ——
اس لئے کہ ایمان کا امانت داری سے گہرا رشتہ ہے۔ دونوں کا مادہ ہی ایک لفظ ہے۔ "امن" سے ہی لفظ امانت بنا اور اسی سے ایمان بنا۔ چنانچہ یہ لازم و ملزوم ہیں' ان کا چولی

دامن کا ساتھ ہے۔ ایمان ہے تو امانت کا وصف بھی ہو گا‘ اگر امانت کا وصف نہیں ہے تو حضور ﷺ کے اس فتویٰ مبارک کی رُو سے حقیقی و قلبی ایمان بھی نہیں ہے ــــــ اسی طرح دین تو اصل میں نام ہے بندے اور رب کے مابین ایک عہد و معاہدہ کا۔ ہم نماز کی ہر رکعت میں جب سورۃ الفاتحہ کی یہ مرکزی آیت پڑھتے ہیں : ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ ﴾ "اے رب ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے" تو یہ اللہ کے ساتھ ایک قول و قرار‘ ایک معاہدہ اور ایک میثاق ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ جو شخص انسانوں کے ساتھ کئے گئے عہد نہیں نباہ سکتا‘ جو انسانوں کے ساتھ کئے ہوئے وعدے پورے نہیں کر سکتا‘ ظاہر بات ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ پوری زندگی کے لئے کیا ہوا اتنا بڑا معاہدہ کیسے نباہے گا۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا : ((لَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ)) ایسا شخص حقیقی دین سے تہی دست ہے۔

ایفائے عہد کے ضمن میں ہمارے اس منتخب نصاب کے دوسرے درس میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ وہاں الفاظ مبارکہ آئے تھے ﴿ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا ﴾ "اور اپنے عہد کو پورا کرنے والے جب کہ باہم کوئی معاہدہ کرلیں"۔ اور وہاں تفصیل سے عرض کیا گیا تھا کہ ہمارے جتنے بھی بین الانسانی معاملات ہوتے ہیں ان سب میں کوئی نہ کوئی معاہدہ کارفرما ہوتا ہے۔ جیسے آجر اور مستاجر کا تعلق کسی نہ کسی معاہدہ پر قائم ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کہیں عارضی یا مستقل ملازمت کر رہا ہے تو ملازم رکھنے والے اور ملازمت کرنے والے کے مابین کوئی قول و قرار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ شادی بھی ایک معاشرتی معاہدہ ہے۔

امانت داری اور ایفائے عہد کا ذکر سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج دونوں میں آیا ہے۔ لیکن سورۃ المعارج میں ایک تیسری چیز کا اضافہ کیا گیا ہے : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝ ﴾ "وہ لوگ جو اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں"۔ غور طلب بات ہے کہ اس کا ذکر سورۃ المومنون میں کیوں نہیں آیا! یہ وہ واحد مثال ہے کہ جب ہم نے دونوں مقامات کا تقابلی مطالعہ کیا تو اس کا ذکر ہمیں سورۃ المومنون کی ابتدائی گیارہ آیات میں نہیں ملا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت شہادت بھی ایک امانت ہے۔ اگر کسی

وقوعہ کے وقت آپ موجود تھے' آپ کی موجودگی میں کسی نے کسی پر دست درازی کی ہے' کسی نے کسی پر کوئی ظلم کیا ہے' کسی نے کسی کو قتل کیا ہے' کوئی دوسرا حادثہ ہوا ہے' تو آپ کی وہاں موجودگی کی بنا پر جو شہادت آپ کے پاس ہے وہ معاشرہ' قوم و ملت اور ملک کی ایک امانت ہے۔ اگر آپ اسے چھپاتے ہیں تو آپ اس امانت میں خیانت کر رہے ہیں۔ لہٰذا جو چیز کسی فعل میں آپ سے آپ مضمر ہوتی ہے قرآن حکیم کہیں اس کا ذکر نہیں کرتا اور کہیں اس مضمر شے کو بھی عیاں کر دیتا ہے۔ چنانچہ شہادت بھی در حقیقت ایک امانت ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے امانت کے تصور کو اتنی وسعت دی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ((اِنَّ الْمَجَالِسَ بِالْاَمَانَاتِ)) "مجالس بھی امانتوں پر قائم ہیں"۔ کسی محفل میں کوئی بات ہو رہی تھی' آپ بھی اس میں موجود تھے' آپ نے وہاں کوئی بات سنی اور کہیں اور جا کر بیان کر دی جب کہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی تو یہ خیانت ہے۔ آپ نے کسی محفل کی بات کو اگر کہیں اور جا کر نقل کر دیا تو غیر شعوری یا شعوری طور پر بات میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے اور بات کرنے والے کے منشاء کے خلاف بھی بیان ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ بات کہنے والے کے صحیح مفہوم کو سمجھ نہ پائے ہوں۔ تو نہ معلوم اس سے کتنے فتنے اٹھنے کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے۔ اور عین ممکن ہے یہی بے احتیاطی بعض لوگوں کو بعض کے خلاف بدظنی اور بدگمانی میں مبتلا کرنے کا سبب بن جائے اور دلوں میں کدورت اور رنجش ڈیرے ڈال لے۔ تو کسی مجلس اور کسی محفل میں آپ شریک ہیں تو وہاں کی باتیں آپ کے پاس ایک امانت کے طور پر ہیں جن کی آپ کو حفاظت کرنی ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ)) جس کسی سے کوئی مشورہ طلب کیا جاتا ہے گویا اس کے پاس بھی ایک امانت رکھوائی گئی ہے۔ مشورہ طلب کرنے والے نے آپ پر اپنا اعتماد ظاہر کیا ہے۔ اب اگر آپ دیانتاً جو رائے رکھتے ہیں وہ کچھ اور ہے' لیکن آپ کسی مصلحت سے اپنی اس دیانت دارانہ رائے کو چھپا کر کوئی اور رائے ظاہر کرتے ہیں تو آپ نے اس کی امانت میں خیانت کی۔ یہ معاملہ بھی' جیسا کہ عرض کیا گیا' شہادت کا ہے۔

سورۃ البقرہ میں ایک بڑی اہم آیت ہے جس کے درمیان میں فرمایا گیا ہے : ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ... ﴾ (آیت ۱۴۰) "اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا کہ جس کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی شہادت ہو اور وہ اسے چھپائے"۔ اس فرمان الٰہی اور امانت و شہادت کے حوالہ سے ہمیں امت مسلمہ کا جو فرض منصبی ہے اسے سمجھنا چاہئے۔ ہمارے پاس اللہ کا کلام ہے' اللہ کی ہدایت ہے' اللہ کا قانون ہے' اور اللہ کی شریعت ہے۔ پھر ہمارے پاس اللہ کے رسول جناب محمد ﷺ کی سنت ہے' حضور ﷺ کی احادیث ہیں۔ آپ ؐ کا اسوۂ حسنہ کامل صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ تمام امانتیں ہیں جن کو ادا کرنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمارے کاندھوں پر رکھی گئی ہے' لہٰذا ان امانتوں کو ادا کرنا پوری اُمت مسلمہ کا فریضہ ہے۔ اس لئے کہ یہ پوری نوع انسانی کے لئے ہیں' صرف ہمارے لئے نہیں ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا وصف رسول امین یعنی امانت دار رسول ؐ ہے' جن کے پاس پیغام ربانی آیا اور انہوں نے اسے بلا کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیا۔ چنانچہ امانت کا حق ادا کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس پیغام کے پہلے امین ہیں' ان کا لقب بھی رسول امین ہے۔ دوسرے امین جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ امانت پہنچائی نبی اکرم ﷺ کو' اور حضور ﷺ نے یہ امانت پہنچا دی اُمت کو ــــــ اور اسی کو ہم یوں تعبیر کریں گے کہ نبی اکرم ﷺ نے اُمت کے سامنے حق کی گواہی دے دی' توحید کی گواہی دے دی' اپنی رسالت کی گواہی دے دی' قرآن کی حقانیت کی گواہی دے دی' دین و شریعت کے اوامر و نواہی اور ہر ہر فعل و عمل کی گواہی دی' قولاً بھی اور عملاً بھی۔ اب اس امانت اور شہادت کو ادا کرنے کی ذمہ داری کا بوجھ اُمت مسلمہ کے کاندھوں پر عائد ہوتا ہے' جس کا ہر وہ شخص ایک فرد اور رُکن ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا اور کہلواتا ہے۔

ہمارا فرض منصبی یہ قرار دیا گیا ہے کہ ہم اس حق کی' اس دین کی' اس توحید کی اور جناب محمد ﷺ کی رسالت کی شہادت دیں' کہ جن کے توسط سے ہمیں یہ "الہدیٰ" اور یہ "الحق" ملا ہے۔ اس موقع پر علامہ اقبال کا یہ مصرع بے اختیار میری زبان پر آ جاتا ہے

وقوعہ کے وقت آپ موجود تھے' آپ کی موجودگی میں کسی نے کسی پر دست درازی کی ہے' کسی نے کسی پر کوئی ظلم کیا ہے' کسی نے کسی کو قتل کیا ہے' کوئی دوسرا حادثہ ہوا ہے' تو آپ کی وہاں موجودگی کی بنا پر جو شہادت آپ کے پاس ہے وہ معاشرہ' قوم وملت اور ملک کی ایک امانت ہے۔ اگر آپ اسے چھپاتے ہیں تو آپ اس امانت میں خیانت کر رہے ہیں۔ لہٰذا جو چیز کسی فعل میں آپ سے آپ مضمر ہوتی ہے قرآن حکیم کہیں اس کا ذکر نہیں کرتا اور کہیں اس مضمر شے کو بھی عیاں کر دیتا ہے۔ چنانچہ شہادت بھی درحقیقت ایک امانت ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے امانت کے تصور کو اتنی وسعت دی ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا: ((اِنَّ الْمَجَالِسَ بِالْاَمَانَاتِ)) "مجالس بھی امانتوں پر قائم ہیں"۔ کسی محفل میں کوئی بات ہو رہی تھی' آپ بھی اس میں موجود تھے' آپ نے وہاں کوئی بات سنی اور کہیں اور جا کر بیان کر دی جب کہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی تو یہ خیانت ہے۔ آپ نے کسی محفل کی بات کو اگر کہیں اور جا کر نقل کر دیا تو غیر شعوری یا شعوری طور پر بات میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے اور بات کرنے والے کے منشاء کے خلاف بھی بیان ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ بات کہنے والے کے صحیح مفہوم کو سمجھ نہ پائے ہوں۔ تو نہ معلوم اس سے کتنے فتنے اٹھنے کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے۔ اور عین ممکن ہے یہی بے احتیاطی بعض لوگوں کو بعض کے خلاف بدظنی اور بدگمانی میں مبتلا کرنے کا سبب بن جائے اور دلوں میں کدورت اور رنجش ڈیرے ڈال لے۔ تو کسی مجلس اور کسی محفل میں آپ شریک ہیں تو وہاں کی باتیں آپ کے پاس ایک امانت کے طور پر ہیں جن کی آپ کو حفاظت کرنی ہے ـــــ اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ)) جس کسی سے کوئی مشورہ طلب کیا جاتا ہے گویا اس کے پاس بھی ایک امانت رکھوائی گئی ہے۔ مشورہ طلب کرنے والے نے آپ پر اپنا اعتماد ظاہر کیا ہے۔ اب اگر آپ دیانتا جو رائے رکھتے ہیں وہ کچھ اور ہے' لیکن آپ کسی مصلحت سے اپنی اس دیانت دارانہ رائے کو چھپا کر کوئی اور رائے ظاہر کرتے ہیں تو آپ نے اس کی امانت میں خیانت کی۔ یہ معاملہ بھی' جیسا کہ عرض کیا گیا' شہادت کا ہے۔

سورۃ البقرہ میں ایک بڑی اہم آیت ہے جس کے درمیان میں فرمایا گیا ہے : ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ... ﴾ (آیت ۱۴۰) "اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا کہ جس کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی شہادت ہو اور وہ اسے چھپائے"۔ اس فرمانِ الٰہی اور امانت و شہادت کے حوالہ سے ہمیں اُمت مسلمہ کا جو فرض منصبی ہے اسے سمجھنا چاہئے۔ ہمارے پاس اللہ کا کلام ہے' اللہ کی ہدایت ہے' اللہ کا قانون ہے' اور اللہ کی شریعت ہے۔ پھر ہمارے پاس اللہ کے رسول جناب محمد ﷺ کی سنت ہے' حضور ﷺ کی احادیث ہیں۔ آپؐ کا اسوۂ حسنہ کامل صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ تمام امانتیں ہیں جن کو ادا کرنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمارے کاندھوں پر رکھی گئی ہے' لہٰذا اِن امانتوں کو ادا کرنا پوری اُمت مسلمہ کا فریضہ ہے۔ اس لئے کہ یہ پوری نوعِ انسانی کے لئے ہیں' صرف ہمارے لئے نہیں ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا وصف رسول امین یعنی امانت دار رسولؐ ہے' جن کے پاس پیغام ربانی آیا اور انہوں نے اسے بلا کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیا۔ چنانچہ امانت کا حق ادا کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس پیغام کے پہلے امین ہیں' ان کا لقب بھی رسول امین ہے۔ دوسرے امین جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ امانت پہنچائی نبی اکرم ﷺ کو' اور حضور ﷺ نے یہ امانت پہنچا دی اُمت کو ـــــ اور اسی کو ہم یوں تعبیر کریں گے کہ نبی اکرم ﷺ نے اُمت کے سامنے حق کی گواہی دے دی' توحید کی گواہی دے دی' اپنی رسالت کی گواہی دے دی' قرآن کی حقانیت کی گواہی دے دی' دین و شریعت کے اوامر و نواہی اور ہر ہر فعل و عمل کی گواہی دی' قولاً بھی اور عملاً بھی۔ اب اس امانت اور شہادت کو ادا کرنے کی ذمہ داری کا بوجھ اُمت مسلمہ کے کاندھوں پر عائد ہوتا ہے' جس کا ہر وہ شخص ایک فرد اور رُکن ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا اور کہلواتا ہے۔

ہمارا فرض منصبی یہ قرار دیا گیا ہے کہ ہم اس حق کی' اس دین کی' اس توحید کی اور جناب محمد ﷺ کی رسالت کی شہادت دیں' کہ جن کے توسط سے ہمیں یہ "الہدیٰ" اور یہ "الحق" ملا ہے۔ اس موقع پر علامہ اقبال کا یہ مصرع بے اختیار میری زبان پر آ جاتا ہے

کہ : ع "دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی" یہ گواہی ہمیں قولاً بھی دینی ہے اور عملاً اور فعلاً بھی۔ یہ گواہی ہم نے اپنی گفتگو' دعوت و تبلیغ اور اپنی قوت بیانیہ سے دینی ہے۔ یہ گواہی ہم نے اپنے قلم سے 'مدلل مضامین و مقالات کی صورت میں دینی ہے' اور یہ گواہی ہمیں اپنے کردار اور اپنی سیرت سے دینی ہے ــــــ اگر ہم یہ نہیں کرتے تو ہم کتمان شہادت کے بہت بڑے مجرم ثابت ہو رہے ہیں : ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ... ﴾

یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ اس آیت سے چند آیات بعد سورۃ البقرہ میں اُمت مسلمہ کا فرض منصبی بایں الفاظ مبارکہ بیان ہوا ہے : ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾ یعنی ہم نے تمہیں ایک اُمت وسط (درمیانی امت) بنایا ہی اس لئے ہے کہ تم ہو جاؤ گواہ پوری نوع انسانی پر اور رسولؐ گواہ ہو جائیں تم پر۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم از کم دو جگہ ضرور آتے ہیں۔ سورۃ المومنون کی گیارہ اور سورۃ المعارج کی سترہ آیات کے باہمی تقابل سے ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی ہے اور ان مضامین کی اہمیت بھی سامنے آ گئی ہے۔ اسی کی ایک مثال اور جان لیجئے۔ سورۃ المومنون سے متصلاً قبل سورۃ الحج ہے۔ سورۃ المومنون کی پہلی آیت ہے : ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ اور سورۃ الحج کی جو آخری آیت ہے اس میں اسی شہادت علی الناس کا ذکر ہے۔ مسلمانوں سے خطاب فرما کر کہا جا رہا ہے : ﴿ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ ﴾ یعنی اللہ کی راہ میں محنتیں کرو' مشقتیں کرو' ایثار کرو' قربانیاں دو' جان و مال کھپاؤ' مجاہدہ کرو' جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے۔ تمہیں امورِ نبوت کا وارث بنا دیا' کتاب الٰہی کا وارث بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم ترین امانت تمہارے سپرد کی ہے' اب اس کا حق ادا کرو ــــــ اور اسی آیت میں ایک Subordinate Clause کے بعد الفاظ آئے : ﴿ لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ "تاکہ رسول (ﷺ) گواہ بن جائیں تم پر اور تم گواہ بن جاؤ پوری نوع انسانی پر" ــــــ تو یہ ہے

پوری اُمت مسلمہ کی اجتماعی (Collective) ذمہ داری جو شہادت کے اس لفظ کے حوالہ سے ہمیں جان لینی چاہیئے۔

ان آیات کے ذریعے تین اوصاف پاس امانت' پاس عہد اور شہادت کی ادائیگی کے بعد' سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج دونوں میں اولین اور اہم ترین وصف یعنی اقامت صلوٰۃ اور اس کی حفاظت کے وصف کا اعادہ فرمایا گیا ﴿ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ ﴾ اور ﴿ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ ﴾ کے الفاظ میں —— پھر سورۃ المومنون میں فرمایا گیا : ﴿ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ' هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾ اور سورۃ المعارج میں ارشاد ہوا : ﴿ أُولٰٓئِكَ فِیْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۝ ﴾ یہ ہیں وہ لوگ جو جنت الفردوس کے وارث بنیں گے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کا اعزاز و اکرام ہوگا جنتوں میں —— اللہ تعالیٰ ہمیں ان اوصاف کو اپنی شخصیتوں میں پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں بھی جنت میں داخل ہونے والوں میں شامل کر دے۔ آمین یارب العالمین!

کہ : ع "دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی" یہ گواہی ہمیں قولاً بھی دینی ہے اور عملاً اور فعلاً بھی۔ یہ گواہی ہم نے اپنی گفتگو' دعوت و تبلیغ اور اپنی قوت بیانیہ سے دینی ہے۔ یہ گواہی ہم نے اپنے قلم سے مُدلّل مضامین و مقالات کی صورت میں دینی ہے' اور یہ گواہی ہمیں اپنے کردار اور اپنی سیرت سے دینی ہے ـــــ اگر ہم یہ نہیں کرتے تو ہم کتمان شہادت کے بہت بڑے مجرم ثابت ہو رہے ہیں : ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ... ﴾ ○

یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ اس آیت سے چند آیات بعد سورۃ البقرہ میں اُمت مسلمہ کا فرض منصبی بایں الفاظ مبارکہ بیان ہوا ہے : ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾ یعنی ہم نے تمہیں ایک اُمت وسط (درمیانی امت) بنایا ہی اس لئے ہے کہ تم ہو جاؤ گواہ پوری نوع انسانی پر اور رسولؐ گواہ ہو جائیں تم پر۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم از کم دو جگہ ضرور آتے ہیں۔ سورۃ المومنون کی گیارہ اور سورۃ المعارج کی سترہ آیات کے باہمی تقابل سے ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی ہے اور ان مضامین کی اہمیت بھی سامنے آگئی ہے۔ اسی کی ایک مثال اور جان لیجئے۔ سورۃ المومنون سے متصلاً قبل سورۃ الحج ہے۔ سورۃ المومنون کی پہلی آیت ہے : ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ ﴾ اور سورۃ الحج کی جو آخری آیت ہے اس میں اسی شہادت علی الناس کا ذکر ہے۔ مسلمانوں سے خطاب فرما کر کہا جا رہا ہے : ﴿ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ ﴾ یعنی اللہ کی راہ میں محنتیں کرو' مشقتیں کرو' ایثار کرو' قربانیاں دو' جان و مال کھپاؤ' مجاہدہ کرو' جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے۔ تمہیں امورِ نبوت کا وارث بنا دیا' کتاب الٰہی کا وارث بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم ترین امانت تمہارے سپرد کی ہے' اب اس کا حق ادا کرو ـــــ اور اسی آیت میں ایک Subordinate Clause کے بعد الفاظ آئے : ﴿ لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ "تاکہ رسول (ﷺ) گواہ بن جائیں تم پر اور تم گواہ بن جاؤ پوری نوع انسانی پر" ـــــ تو یہ ہے

پوری امت مسلمہ کی اجتماعی (Collective) ذمہ داری جو شہادت حق کے اس لفظ کے حوالہ سے ہمیں جان لینی چاہیے۔

ان آیات کے ذریعے تین اوصاف پاس امانت' پاس عہد اور شہادت کی ادائیگی کے بعد' سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج دونوں میں اولین اور اہم ترین وصف یعنی اقامت صلوٰۃ اور اس کی حفاظت کے وصف کا اعادہ فرمایا گیا ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ ﴾ اور ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ ﴾ کے الفاظ میں۔

پھر سورۃ المومنون میں فرمایا گیا : ﴿ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ' هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾ اور سورۃ المعارج میں ارشاد ہوا : ﴿ أُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۝ ﴾ یہ ہیں وہ لوگ جو جنت الفردوس کے وارث بنیں گے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کا اعزاز و اکرام ہو گا جنتوں میں۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اوصاف کو اپنی شخصیتوں میں پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں بھی جنت میں داخل ہونے والوں میں شامل کر دے۔ آمین یارب العالمین!

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاھور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ــــ اور ــــ **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ــــ اور ــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ھے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ــ اور ــ **غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ